
ماہنامہ
مُسلمان بچّے
بچوں کے اسلامی و اخلاقی ادب کا ترجمان
189
لاہور
ذیقعد ۱۴۴۴/جون 2023
www.muslimanbachay.com
قدردانی
وہ کون تھا...؟
HOSPITAL
خاموش خدمت
ایک دلچسپ تحریر
خوبصورت کون؟
ایک فکر انگیز تحریر
اس کے علاوہ اور بہت کچھ
جانباز کے نام

سب سے منفرد اور کثیر الاشاعت

ماہنامہ

مُسلمان بچے

لاہور
پاکستان

بچوں کے
اسلامی، اخلاقی، تعلیمی
تربیتی ادب کا ترجمان

بچے تو سبھی ہیں بہت اچھے
مگر سب سے اچھے مسلمان بچے

ذی قعدہ ۱۴۴۴ھ بمطابق جون 2023ء

شمارہ: 11 جلد: 16

قیمت فی شمارہ: 70 روپے

سالانہ زرِ تعاون =/840 روپے

اپنی کہانیاں، مضامین صرف اس پتے پر ارسال فرمائیں

پوسٹ بکس نمبر: 15 جی پی او، بہاولپور

ترسیلِ رقم اور حصولِ رسالہ کیلئے:

مکتبۃ ابنِ مبارک

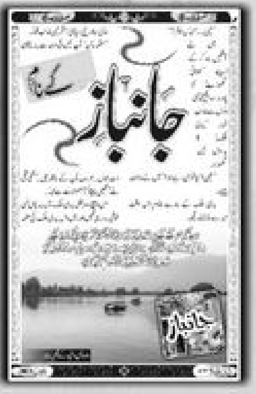
37۔ حق سٹریٹ
اردو بازار۔ لاہور

موبائل: 0322-5140485

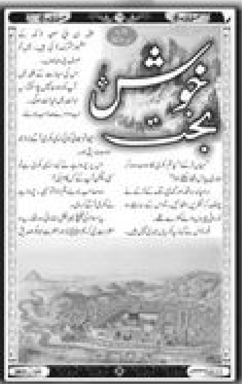
پبلشر محمد زاہد نے علی پریس لاہور سے چھپوا کر تقسیم کیا

اس شمارے میں









اس کے علاوہ مستقل سلسلوں کے ساتھ ساتھ اور بہت کچھ۔۔۔۔



فرمان باری تعالیٰ

اور زمین میں ٹکڑے ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اور انگور کے باغ ہیں اور کھیتیاں اور کھجوریں ہیں ایک کی جڑ ملی ہوئی بعض بن ملی انہیں پانی بھی ایک ہی دیا جاتا ہے، اور ہم ایک کو دوسرے پر پھلوں میں فضیلت دیتے ہیں، بے شک اس میں عقل مندوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔

(الرعد)

حمد باری تعالیٰ

(انتخاب: محمد اسامہ)

ہم پہ بے انتہا کرم فرما
دور دنیا کے سارے غم فرما

ظلمتیں پے بہ پے امڈتی ہیں
بارشِ نور دم بہ دم فرما

ہے یہ تیرے حبیب ﷺ کی امت
قومِ آخر کو محترم فرما

اس کے ہاتھوں ہے تنگ خلق خدا
سرِ طاغوت اب تو خم فرما

یا الٰہی بحق ختمِ رسل ﷺ
اونچا ایمان کا عَلم فرما

فرمان رسول اکرم ﷺ

آپ ﷺ نے فرمایا:
جس کسی میں یہ تین باتیں ہوں گی وہ ایمان کی مٹھاس (مزہ) پائے گا، وہ شخص جس کے نزدیک اللہ اور اس کا رسول تمام ماسوا سے محبوب ہو اور وہ شخص جو کسی بندہ سے صرف اللہ تعالیٰ کے لئے محبت کرے اور وہ شخص جو ایمان نصیب ہونے کے بعد کفر اختیار کرنے کو ایسا برا سمجھے جیسے کوئی آگ میں ڈالے جانے کو برا سمجھتا ہے۔ (بخاری)



نعت رسول مقبول ﷺ

(انتخاب: محمد داؤد)

اگر اس ہجر کی شب میں ترا دیدار ہوجائے
دیوانہ اور کیا چاہے جو سوئے دار ہوجائے

تری صحبت سے جو کوئی برابر فیض پاتا ہے
ابو بکر و عمر ، عثمان یا کرار ہو جائے

تو مالک ہے ترا اعجاز ہے عقلوں سے بالاتر
کبھی قہار ہوجائے کبھی ستار ہوجائے

مِرے محبوب کے سارے صحابہ پاک ہیں لوگو
کہ ان کی شان میں قرآن بھی بستار ہو جائے

خبیب اُن کی وفاداری میں گزرے زندگی اپنی
کہ یوں محشر میں اُن کے سامنے سرشار ہوجائے



ایک دُعا یاد کیجئے

اَللّٰھُمَّ انْفَعْنِیْ بِمَا عَلَّمْتَنِیْ وَ عَلِّمْنِیْ
مَا یَنْفَعُنِیْ وَ زِدْنِیْ عِلْمًا

ترجمہ: یا اللہ! مجھے فائدہ دیجئے اس کے ساتھ جو آپ نے مجھے سکھایا ہے اور مجھے سکھائیے جو میرے لیے فائدہ مند ہے اور میرے علم میں اضافہ فرما دیجئے۔ (ابن ماجہ)

ایک حدیث یاد کیجئے

قَالَ رَسُوْلُ اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مَنْ کَذَبَ عَلَیَّ مُتَعَمِّداً
فَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہٗ مِنَ النَّار

ترجمہ: جس نے مجھ پر جھوٹ بولا، وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنا لے۔ (صحیح بخاری)

ناخدا ہمت سے آشنا ہوتے

ہم ایسی جنگ کو حکمت سے ٹال سکتے تھے
بھنور سے کشتی ملت نکال سکتے تھے

ذرا تدبیر کے ناخن جو رہنما لیتے
متاعِ کارواں کو بھی سنبھال سکتے تھے

دکھائی بزدلی ہوتی نہ حکمرانوں نے
عدو کی سازشیں خود اس پہ ڈال سکتے تھے

اگر یہ ناخدا ہمت سے آشنا ہوتے
تہ گرداب سے ناؤ اچھال سکتے تھے

نہیں لی روشنی فتح الجواد سے ورنہ
ہم اپنے رنگ میں دنیا کو ڈھال سکتے تھے

نبیؐ سیف کے اسوہ سے روشنی لے کر
ہم اس تہذیب کا چہرا اجال سکتے تھے

ہمیں ہی فہم و تدبر سے کام لے لیتے
جنوں مزاج قیادت خیال سکتے تھے

بسا کے نور بصیرت کو انورؔ آنکھوں میں
سبھی حالات میں ہم دیکھ بھال سکتے تھے

انتخاب: مریم بنت جمیل

بسم اللہ الرحمن الرحیم

السلام علیکم

اللہ تعالیٰ کا لاکھ شکر و احسان ہے کہ اس نے ہمیں دنیا کی بہترین اور کتنی ہی مفید نعمتوں سے سرفراز فرمایا ہے۔ اگر ہم اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کا شمار کرنا چاہیں تو یہ ناگزیر ہے۔ ان ہی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ''والدین'' بھی ہیں۔

یہ ہمارے وجود کا ظاہری سبب ہیں۔ ان سے بڑھ کر مخلص اور بے لوث محبت کرنے والا کوئی نہیں اور ان کے بغیر انسانی معاشرے کی تشکیل اور تعمیر ممکن نہیں۔

ماں! کس قدر پیارا رشتہ! جس کی آنکھوں میں ہر لحظہ مامتا جھلکتی ہے۔ لبوں پر تبسم، قلب و جگر میں سراپا محبت ہوتی ہے۔ جس کا آنچل الفت و رحمت سے بھرا ہوتا ہے اور باپ جو ایک سائبان کی مانند ہوتا ہے۔ ایک ایسا محافظ جو ساری زندگی اپنے بچوں کی حوادثات زمانہ سے حفاظت کرتا ہے۔ اپنی عمر بھر کی خوشیوں اور خواہشات کو اپنے بچوں کی خوشیوں اور خواہشات کی تکمیل پر قربان کر کے خوش ہوتا ہے۔ وہ بچے کو معاشرے میں زندہ رہنے کے قابل بنانے اور اسے زمانے کے ہر سرد و گرم سے بچانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

جہاں والدین اس قدر بڑی نعمت کے طور پر ہمیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کئے گئے ہیں وہیں فی زمانہ ہم ان کی ناقدری اور بسا اوقات ان کے ساتھ ناروا سلوک کے بھی مرتکب ہوتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کریم میں جہاں اللہ تعالیٰ نے اپنی عبادت و اطاعت اور شکر گزاری کا حکم دیا ہے اس کے فوراً بعد ''برالوالدین'' یعنی والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے اور اس سلسلے میں بے نظیر احکام عطا فرمائے ہیں۔ لہذا چند باتوں کا خاص دھیان کریں۔

والدین کا مکمل احترام کریں، انہیں وقت دیں۔ آج کے دور میں بچے ویڈیو گیمز، سوشل میڈیا اور کمپیوٹر میں مشغولیت کی وجہ سے اپنے والدین کو وقت نہیں دیتے۔ یاد رکھیں آپ کے والدین کو آپ کی ضرورت ہے ان کے پاس وقت گزاریں۔ ان کے ساتھ بیٹھنا خانہ پری اور جبر والا نہ ہو بلکہ ایسا بیٹھنا ہو جیسے دو انتہائی محبت کرنے والے دوست آپس میں گپ شپ کیا کرتے ہیں۔

ان کے ساتھ اونچی آواز میں بات نہ کریں۔ کیونکہ قرآن کریم میں اس کی شدید ممانعت وارد

ہوئی ہے۔ والدین کسی غلطی پر ہوں تب بھی ان کے سامنے اونچی آواز میں بات نہ کریں بلکہ خاموش ہو جائیں یا ان کے ہاں میں ہاں ملائیں۔تاکہ ان کی دل آزاری نہ ہو۔

والدین کی اطاعت وفرمانبرداری کریں۔ان کے ہر جائز کام کی تکمیل کی کوشش کریں۔ان کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھیں اور اس تکلیف کو دور کرنے کی حتی الامکان کوشش کریں۔ یاد رکھیں والدین کی نافرمانی کی مذمت کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اس کی ناک خاک میں مل گئی یعنی وہ تباہ وبرباد ہوگیا، جس نے اپنے ماں باپ میں سے کسی ایک یا دونوں کو بڑھاپے کی حالت میں پایا اور پھر ان کی خدمت کر کے جنت میں داخل نہیں ہوا۔

بلاشبہ والدین کی اطاعت وفرماں برداری اور ان کی خدمت جنّت کی طرف لے جانے والا راستہ ہے اور ان سے محبّت، ان کا اکرام واعزاز اور ان کی ضرورتوں کی تکمیل انتہائی بڑی عبادت ہے جو دنیا اور آخرت میں اجرِ عظیم کا باعث ہے۔

ابو محمد عروہ

حمیرا علی





وہ کون تھا؟

وہ باباجی روز اس کے اسکول کے سامنے اپنی مخصوص جگہ پر آلو چاٹ کی ایک پرات لے کر بیٹھتے تھے۔فہد اسکول سے چھٹی کے بعد گھر جاتے ہوئے اکثر ان کے بارے میں سوچتا تھا لیکن کبھی بات کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

باباجی کے قریب رکھی بیساکھی بتاتی تھی کہ وہ معذور ہیں اور اس کے باوجود وہ بھیک مانگنے کے بجائے محنت سے کمانے کو ترجیح دے رہے ہیں۔

وہ ایک بوڑھے اور ناتواں شخص فہد کے لیے کسی معمہ سے کم نہ تھے۔اکثر فہد نے اسکول جلدی آ کر یہ جاننے کی کوشش کی کہ وہ یہاں کس طرح آتے ہیں۔آیا اُنہیں کوئی چھوڑ کر جاتا ہے یا وہ تنہا آتے ہیں مگر وہ جاننے میں ناکام رہا۔

وہ بزرگ علی الصبح آجاتے تھے شاید نمازِ فجر کے فوراً بعد فہد نے جب بھی دیکھا وہ اس جگہ بیٹھے ہوئے ملے۔ ان کا سنجیدہ چہرہ درد و تکلیف کی تحریر سے اٹا ہوا ہوتا تھا۔ان کے چہرے پر صدیوں کی تھکن ہوتی تھی۔کپڑے کبھی صاف ستھرے کبھی میلے ہوتے پرات میں چاٹ بھی کبھی نہ ہونے کے برابر ہوتی مگر ایک بات طے تھی کہ وہ ناغہ نہیں کرتے تھے۔آندھی آئے یا طوفان وہ روز اپنی جگہ پر موجود ہوتے تھے۔

فہد نے کبھی انہیں مسکراتے نہیں دیکھا تھا

اور فہد کو یہی بات بے چین کر دیتی تھی۔گھر آ کر کپڑے بدلنے اور کھانا کھانے کے بعد آرام کرنے کے لیے بستر پر لیٹنے تک وہ اُنہی کے متعلق سوچتا رہتا۔

”کیا ان کی کوئی اولاد نہیں اور اگر ہے بھی تو کیا اس قدر بے حس ہے؟ وہ شخص اس عمر میں تپتی دھوپ میں بیٹھا ہوتا ہے۔آسمان کبھی تو آگ برساتا اور کبھی بارش امتحان بن جاتی ہے۔یہ بوڑھا معذور شخص ہر موسم میں یہاں موجود ہوتا ہے۔“

اس کا دم گھٹنے لگتا۔وہ دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔ذہین ہی نہیں حساس بھی تھا۔وہ ایک سال سے اپنے اسکول کے باہر انہیں روز اسی طرح چاٹ بیچتے دیکھتا آ رہا تھا۔بالکل گم صم اور اداس۔ان کی آنکھوں میں کبھی کبھی آنسو بھی چمکنے لگتے تھے۔

ایک دو بار فہد نے اپنے دوستوں کے ساتھ ان سے آلو چاٹ خرید کر کھائی مگر سچ تو یہ تھا کہ فہد کے لیے اس شخص کو قریب سے دیکھنے کا تجربہ بہت ہی تکلیف دہ تھا۔ان کی اداسی فہد کے حساس دل پر اثر انداز ہو کر اسے کئی دن تک مغموم و مضمحل رکھتی تھی لیکن وہ ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔

بات صرف ایک بوڑھے شخص کی نہیں تھی وہ اپنے گھر والوں کے لیے بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا۔وہ کسی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔بے بسی کا احساس حد سے سوا ہونے لگا تو وہ حقیقت سے فرار کے لیے اپنے دوستوں کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے لگا۔کرکٹ کھیلنے کے بہانے گھر سے آدھی رات تک غائب رہتا۔اسکول میں اس کی کارکردگی متاثر ہو رہی تھی۔امتحان سر پر تھے اور اس نے کتابوں کو ہاتھ لگانا چھوڑ دیا تھا۔بیمار بیوہ ماں کو پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن وہ نادانستگی میں ایسا کر رہا تھا۔

اس کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔جب تک اس کے والد حیات تھے زندگی بہت پرسکون اور خوبصورت تھی لیکن والد کے انتقال کے بعد گھر کی ساری ذمہ داری اس کی والدہ کے کندھوں پر آ گئی۔وہ پہلے بھی سلائی کڑھائی کر کے گھر کی ضروریات پوری کرنے میں اپنا حصہ ڈالتی تھیں مگر اب پورے گھر کی ذمہ داری اٹھا رہی تھیں۔

سچ تو یہ تھا کہ فہد اور اس کے بہن بھائیوں کو والد کے انتقال کے بعد کبھی کسی چیز کی کمی نہ ہوئی تھی لیکن حالات بدلتے دیر نہیں لگی۔ان کی والدہ نے آرام کو خود پر جیسے حرام کر لیا تھا۔پچھلے ایک سال میں فہد نے انہیں ہنستے مسکراتے اور پیٹ بھر کر کھانا کھاتے نہیں دیکھا تھا۔

وہ بیمار رہنے لگی تھیں۔نحیف و نادار ہو گئی تھیں وہ اپنی عمر سے زیادہ لگنے لگی تھیں۔اسے اپنے اسکول کے باہر آلو چاٹ بیچنے والے بوڑھے شخص اور اپنے گھر میں چوبیس گھنٹے کام میں مصروف نظر آنے والی اپنی والدہ میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا

اور یہ انکشاف تو فہد کی جان نکال گیا تھا کہ اس کی والدہ دل کے عارضے میں مبتلا ہیں۔اس کے والد ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں ان سے جدا ہوئے تھے اور اب ماں کو دل کا روگ نگل رہا تھا۔ڈاکٹر نے بائی پاس کا کہہ دیا تھا۔

فہد کی راتوں کی نیند اڑ گئی۔ماں کے لیے کچھ کرنا اس کے اختیار میں نہ تھا۔بہن بھائیوں کی ذمہ داری اٹھانے کے بھی قابل نہ تھا۔پچھلے کچھ دنوں سے گھر میں فاقوں کی نوبت آ گئی تھی۔وہ کہاں تک حالات سے فرار اختیار کرتا۔اس کے چہرے پہ پریشانی کندہ تھی اور ہاتھ خالی تھے۔اس کے دوست بھانپ گئے تھے مگر کوئی کیا کر سکتا تھا سوائے افسوس کے۔

وہ کھیل کے میدان میں سب سے الگ تھلگ بیٹھا تھا۔نثار اس کا ہم جماعت کچھ دن سے اس کی اداسی اور مایوسی کو محسوس کر کے اس کے ارد گرد منڈلانے لگا تھا۔اسے بھی کسی ہمدرد کی ضرورت تھی جو نثار کی صورت میں میسر آ گیا تھا۔نثار اس کے پاس بینچ پہ آ کر بیٹھا اس نے تیزی سے پلکوں پر چھائی نمی کو انگلیوں کے پوروں سے صاف کیا۔

"فہد! فکر مت کرو۔تمہارے دوست زندہ ہیں ابھی۔میرے ساتھ کام کر لو بہت پیسہ کما سکتے ہو تم۔"

اس کے ہم عمر اور ہم جماعت نثار نے اسے نئی راہ دکھانی چاہی۔

"کونسا کام؟"

اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا حالانکہ اسے کچھ کچھ اندازہ تھا۔نثار نے چند دن پہلے ایک مہنگا موبائل دکھاتے ہوئے کہا تھا یہ اس نے اپنی کمائی سے خریدا ہے۔

"لمبا ہاتھ مارا تھا۔دادا بھائی نے دل کھول کر پیسے دیئے تھے۔"

اس نے اس کے کام کے متعلق کریدنا چاہا تو وہ ٹال گیا لیکن اب وہ اسے اپنے کام میں شریک کرنا چاہتا تھا۔

اسے دوستوں کی چہ میگوئیاں یاد آنے لگیں۔

"نثار نے اسکول کے بعد برے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا شروع کر دیا ہے۔اپنے والد کے انتقال اور بڑے بھائی کے ملک سے باہر جاتے ہی وہ بگڑ گیا ہے۔"

فہد نے سب باتیں یاد کر کے اسے انکار کر دیا۔

"نہیں میں کچھ نہ کچھ کر لوں گا۔"

نثار کچھ دیر تک اسے آمادہ کرنے کے لیے سبز باغ دکھاتا رہا۔اپنے باس جنہیں وہ "دادا بھائی" کہتا تھا کی دریا دلی کے قصے بھی سنائے لیکن اس کے اصرار کے باوجود فہد نے انکار کر دیا نثار انکار سن کر ہتھے سے اکھڑ گیا۔

"کیا کرو گے تم آخر بھیک مانگو گے یا اس

لنگڑے بابا کی طرح آلو کی چاٹ بیچو گے؟"

نثار نے اس کا تمسخر اُڑایا۔فہد کا چہرہ سرخ ہوگیا۔اس کا مزاج نرم تھا۔لڑائی جھگڑے سے کوسوں دور بھاگتا تھا لہٰذا نثار جیسے جھگڑالو لڑکے سے اُلجھنے کے بجائے وہ تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا نثار سے دور ہوتا چلا گیا۔اس کے عقب میں نثار کا قہقہہ گونج رہا تھا۔

"بزدل،بے وقوف، بھیک مانگتے ہوئے نظر آؤ گے تم یا پھر آلو کی چاٹ بیچو گے۔"

نثار اس کا مذاق اڑا رہا تھا لیکن اس نے پلٹ کر دیکھنا بھی مناسب نہ سمجھا۔ذہن الجھا ہوا تھا اسے پتا نہیں چلا اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے تھے۔گھر پہنچنے تک وہ نثار سے دوبارہ نہ ملنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ایسے نام نہاد دوستوں سے قطع تعلق بہتر جو دوستی کے پردے میں دشمن سے بھی چار ہاتھ آگے ہوتے ہیں۔ایسے لوگ آستین کے سانپ ہوتے ہیں۔وہ ایسا بے ضمیر نہیں تھا کہ اپنے مصائب سے تنگ آ کر لوٹ مار شروع کر دیتا۔اسے اللہ سے امید تھی کہ وہ ضرور کوئی راستہ نکالے گا۔اللہ کی مدد تو شامل حال تھی ہی۔اس کی ماں کی تربیت نے بھی اسے غلط راہ پر چلنے سے روک لیا تھا۔

اس کے پاس کوئی راستہ نہ تھا۔نہ کوئی الہ دین کا چراغ تھا،نہ ہی وہ کسی نیک پری کو جانتا تھا جو اس کی مدد کرتی۔گھر کے حالات خراب تھے اور ماں سرکاری اسپتال میں بے یار و مددگار اپنی زندگی کے دن گن رہی تھیں۔ہر گزرتے دن کے ساتھ ڈاکٹر بائی پاس کرانے پر زور دینے لگے تھے۔

فہد نے دو چار دن پریشان رہنے کے بعد نثار کی تجویز پر عمل درآمد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔نثار نے بات تو ٹھیک کی تھی۔وہ اس وقت شدید غصے میں تھا لہٰذا نثار کی تجویز پر دھیان نہیں دیا تھا لیکن اپنی ماں کو دن بہ دن موت سے قریب تر ہوتے ہوئے دیکھنا نہایت اذیت ناک تھا۔وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کسی غیبی امداد کا انتظار آخر کب تک کرتا؟کئی دنوں سے وہ اسکول نہیں جا رہا تھا بلکہ وہ کیا اس کے تینوں چھوٹے بہن بھائی اسکول جانا چھوڑ چکے تھے۔اس نے آج بھی کندھے پر بستہ نہیں لٹکایا۔اپنے بہن بھائیوں کو گھر میں چھوڑ کر وہ اسکول کی سمت آ گیا۔اس کے ہاتھ میں اس کی ضرورت کی چیزیں تھیں اور وہ اپنے لیے کوئی جگہ ڈھونڈ رہا تھا۔

"بہت دن بعد دیکھا تمہیں۔"

اس کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا اس نے چونک کر دیکھا وہ اس کا ہم جماعت تھا۔

"آج کل تم اسکول کیوں نہیں آ رہے؟"

فرقان کلاس کا ایک قابل بچہ تھا۔اسے دیکھ کر فہد نے لبوں پر زبان پھیری۔

"میری امی بیمار ہیں۔"

بقیہ صفحہ 80 پر



تسلیمہ موسیٰ

میں حج کروں گی

بچپن ہی سے یمنیٰ کو حج کرنے اور اللہ کا گھر دیکھنے کا شوق تھا۔ وہ ہر نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی کہ یا اللہ اپنے باقی بندوں کی طرح مجھے بھی اپنے گھر کی زیارت نصیب فرما

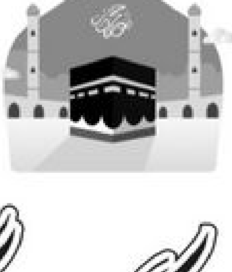
حج کا سیزن شروع ہو چکا تھا۔ حج کی سعادت حاصل کرنے کے لئے بہت سے مسلمان سعودیہ روانہ ہو چکے تھے۔

کلاس روم میں آج ٹیچر بھی حج کے متعلق طلبہ کو بتا رہی تھی۔ انہی میں یمنیٰ بھی تھی۔ وہ بھی بڑے غور سے استانی صاحبہ کی باتیں سن رہی تھی۔

"ہائے! کاش! میں بھی حج کو جاتی"

وہ حسرت سے بولی۔

وہ پانچویں جماعت کی طالبہ تھی۔ حج کے متعلق استانی صاحبہ نے بہت سی باتیں بتا کر طالبات کے علم میں اضافہ کیا۔ ٹیچر زبیدہ کا پیریڈ ختم ہوا تو وہ کلاس روم سے چلی گئیں۔



یمنیٰ استانی صاحبہ کے جانے کے بعد خیالوں میں کھو گئی۔ جہاں وہ خیالوں ہی خیالوں سے تب باہر نکلی جب

اسکی کلاس فیلو سمیرا نے بلند آواز میں کہا
''لو جی یمنیٰ صاحبہ! تو حج کرنے ہی چلی گئی''
سمیرا کی اس بات پر سب ہنس پڑیں۔ یمنیٰ ان کی طرف متوجہ ہوئی۔
''ناں جانے یہ بے چاری حج کو کب جائے گی؟ جائے گی بھی کہ نہیں؟ نہ جانے بے چاری کا گلک کب پیسوں سے بھرے گا؟'' رافعہ نے کہا اور رافعہ کی اس بات پر سب نے قہقہہ لگایا۔ بے چاری یمنیٰ شرمندہ سی ہوگئی اور کتاب کھول کر اس پر نگاہیں جما دیں۔
دراصل یمنیٰ یتیم بچی تھی جب دو سال کی تھی تو اس کے والدین کار حادثے میں چل بسے تب سے لے کر آج تک وہ چچا عابد کے گھر مقیم تھی۔ اس کا چچا ہی اس کی کفالت کر رہا تھا۔
چچا کی مالی حیثیت اتنی اچھی نہ تھی مگر پھر بھی وہ اپنے بچوں کیساتھ یمنیٰ کو بھی تعلیم کے زیور سے آراستہ کر رہا تھا۔
بچپن ہی سے یمنیٰ کو حج کرنے اور اللہ کا گھر دیکھنے کا شوق تھا۔ وہ ہر نماز کے بعد ہاتھ اٹھا کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی کہ یا اللہ اپنے باقی بندوں کی طرح مجھے بھی اپنے گھر کی زیارت نصیب فرما۔
ایک تڑپ تھی اس کے اندر اللہ کا گھر دیکھنے کی چونکہ اس کے چچا کی مالی حیثیت اتنی اچھی نہ تھی وہ جانتی تھی اسکا چچا اسے حج نہیں کروا سکتا تو اس نے کچھ سوچا اور اپنے چھوٹے کزن منیر سے اپنی جیب خرچ سے ایک گلک منگوایا اور پھر اپنی ہر روز کی جیب خرچ ڈالنے لگی، کبھی کبھار جیب خرچ سے پین، پنسیل، کاپی، اِنک وغیرہ خریدتی کیونکہ وہ اپنے چچا پر مزید بوجھ نہیں ڈالنا چاہتی تھی، وہ کلاس روم میں سب سے خوشی سے کہتی کہ وہ اپنے جمع شدہ جیب خرچ کے پیسوں سے حج کو جائیگی، تو اس کی کلاس فیلوز اسکا مذاق اڑاتیں کہ دس روپے جیب خرچ ملتی ہے اور یہ محترمہ چلی ہے دس روپے سے حج کرنے، سب اس پر ہنستیں، تو وہ کہتی ہر چیز کی بنیاد ایک چھوٹی سی چیز پر ہی رکھی جاتی ہے جیسے ایک چھوٹے سے بیج سے ایک تن آور درخت بنتا ہے اور پھر اس پر پھل لگتے ہیں پھر اگر ان پھلوں کے بیج زمین پر بو دیئے جائیں تو ان تمام بیجوں سے مزید کتنے پھلدار درخت پیدا ہونگے۔
یمنیٰ کے اس جواب اور دلیل پر سب لاجواب ہو جاتیں اور اپنی جگہ پر کھسک جاتیں مگر پھر بھی وہ یمنیٰ کا مذاق اڑانے سے باز نہ آتیں۔
اب تو یمنیٰ بھی یہ سوچنے لگی تھی کہ کہیں دس روپے جمع کرتے کرتے وہ خود نہ ختم ہو جائے، مگر اتنی بڑی رقم وہ کیسے جمع کر پائیگی؟ وہ ٹھنڈی آہ بھر کر رہ جاتی۔
یمنیٰ سکول سے گھر آئی تو بجھی بجھی سی تھی۔ اس کی چچی نے کھانے کا پوچھا تو یمنیٰ نے کہا، اسے بھوک نہیں۔ وہ کمرے میں آگئی، بیگ رکھا اور الماری سے گلک اٹھالیا۔ اسے ہلا کر دیکھا تو گلک

آدھا خالی تھا۔ وہ مایوسی سے فرش پر بیٹھ گئی، وہ سامنے دیوار پر لگی، خانہ کعبہ کی پینٹنگ کو دیکھنے لگی اور مایوسی سے بولی، شاید کہ میں اللہ کے گھر کی کبھی زیارت نہ کرسکوں۔ وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی اور رو پڑی۔

وہ پچھلے تین سالوں سے پیسے جمع کر رہی تھی، عید پر جو عیدی ملی تھی آدھی اس میں ڈالی تھی اور آدھی رقم سے نئی کلاس کا کورس خریدا تھا کیونکہ وہ تعلیم کا سارا بوجھ اپنے چچا پر نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔

چچا اور چچی یمنیٰ کی اسی کفایت شعاری سے بہت خوش تھے۔ وہ اپنے بچوں سے زیادہ اسے پیار کرتے تھے۔ ایک ہفتے تک اسکی طبیعت بوجھل رہی۔ چچا اور چچی نے پوچھا بھی مگر وہ بہانہ بنا گئی۔ یمنیٰ جان چکی تھی کہ وہ حج نہیں کر سکتی مگر اس نے ہار نہیں مانی تھی۔ اس کی لگن سچی تھی۔ وہ اللہ سب جانتا تھا۔

''واللہ علی کل شئی قدیر'' اللہ ہر چیز پر قادر ہے، یمنیٰ کو اپنی لگن اور اللہ پر پورا بھروسہ تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ بھی اللہ کے گھر کی زیارت کریگی۔

آج اتوار کا دن تھا اسکے چچا گھر پر تھے اس کے چھوٹے چھوٹے کزن برآمدے میں کھیل رہے تھے اور یمنیٰ چارپائی پر بیٹھی سکول کا کام کر رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

''یمنیٰ جاؤ! دیکھو بیٹا کون ہے؟'' چچی نے کہا

''جی چچی جان!'' اس نے کتابیں رکھیں اور دروازے کھولا تو سامنے ایک اسی اکیاسی سالہ بوڑھا لاغر سا آدمی کھڑا تھا۔ بال الجھے اور مٹی سے اٹے ہوئے تھے۔ پاؤں میں جوتے تک نہ تھے۔ چہرہ گرد آلود تھا۔

''جی بابا! کیا چاہیے؟''

''بیٹا! اللہ کے نام پر کچھ دے دو! میرے چھوٹے پوتے پوتیاں بھوک سے بلک رہے ہیں آج تیسرا دن ہے گھر میں فاقہ ہے، میرا ایک بیٹا تھا جو چھ سال پہلے مزدوری کے لئے باہر نکلا تو ایک گاڑی نے کچل ڈالا، اس کی بیوی اور چار یتیم بچے ہیں۔ اب میں ہی کماتا ہوں اور ان کا پیٹ پالتا ہوں۔ میں نے کبھی بھیک نہیں مانگی مگر آج مجبور ہو کر تم لوگوں کے دروازے پر آیا ہوں۔ تین دن سے کوئی کام نہیں ملا۔

بیٹا! خالی ہاتھ مت لوٹانا! میرے بچے بھوک سے بلک رہے ہیں تین دن سے ایک نوالہ بھی انکے حلق میں نہیں گیا وہ مر جائینگے۔'' بوڑھے کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے یمنیٰ کو دکھ ہوا تھا۔ تبھی چچا عابد آ گیا۔

''کون ہے بیٹا؟''

''چاچو! یہ بابا جی ہیں اللہ کے نام پر کچھ مدد مانگ رہا ہے''

''کیا ہے بابا جی؟'' چچا عابد روکھے پن سے

بولا۔

''بیٹا! اللہ کے نام پر کچھ دے دو! میرے بچے تین دن سے بھوکے ہیں، کوئی بھی مدد نہیں کر رہا۔ بیٹا! اللہ تمہارا بھلا کرے۔ مدد کرو میری'' بوڑھے نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

''جاؤ بابا! جاؤ! معاف کرو! نہیں ہے ہمارے پاس کچھ''

''بیٹا! ایسا نہ کرو میرے بچے بھوک سے مر جائینگے۔'' بوڑھا رو پڑا وہ عابد کی منتیں کرنے لگا۔

''ارے! بابا جاؤ! یہ رونا دھونا ہمیں بھی آتا ہے، پیسے مانگنے کے لئے تم لوگوں کو خوب بہانے بنانے آتے ہیں۔ ہم خود غریب لوگ ہیں تمہیں کہا ں سے دیں؟ جاؤ اب!''

''خدا کا واسطہ ہے خالی ہاتھ نہ لوٹاؤ! بڑی امید لے کر آیا تھا۔ میرے بچے مر جائینگے۔'' بوڑھا بے چارا روتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر بولا۔

''ارے بابا جی! ضد کیوں کر رہے ہیں؟ کہا ناں معاف کرو نہیں ہے ہمارے پاس کچھ۔'' چچا عابد نے دروازے بند کر دیا۔

بوڑھے کی رونے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ یمنیٰ کو اس پر بے حد ترس آیا تھا۔ اچانک



ہی اسے خیال آیا۔ وہ کمرے میں آئی اور الماری سے اپنا گلک اٹھالیا۔

''کیا میں یہ اس بابا کو دے دوں؟''

''نہیں، نہیں، ایسا مت کرنا ورنہ تم حج کیسے کروگی؟'' شیطان نے اسے اس نیک کام سے روکنے کے لئے آواز لگائی۔

''یمنیٰ! اس شیطان کی باتوں میں مت آؤ! یہ اس بوڑھے کو دے دو! اللہ تمہیں اور دیگا اور سوچو تمہاری اس مدد سے کتنی جانیں بچ جائینگی اور یہ سوچو کہ کتنی دعائیں ملیں گی کتنا فائدہ ہے تمہارے لیے اس میں، کیا پتہ اللہ کو تمہاری یہ نیکی پسند آجائے اور تمہاری دعائیں قبول کرے، یمنیٰ! اللہ کے ساتھ سوا کرلو! یہ بہت نفع والا سودا ہے، فائدے میں رہوگی، اللہ کے بندوں کی مدد کرو اللہ تعالیٰ مدد کریگا'' اس کے ضمیر نے آواز بلند کی۔

''اس کی مت سنو یمنیٰ! یہ سوچو کہ کتنی محنت سے

تم نے یہ پیسے جمع کئے ہیں۔اب اگر دے دوگی تو سوچو کتنے سالوں کی جمع پونجی تم ضائع کروگی؟"

شیطان کے اس وسوسے نے یمنیٰ کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔واقعی بات تو سچی ہے۔

شیطان یمنیٰ کو یوں سوچوں میں گم دیکھ کر خوش ہو رہا تھا کہ اسکا وار کامیاب گیا مگر پھر یمنیٰ کی طرف سے ایسا وار پڑا کہ وہ بھاگ کھڑا ہوا۔

"نہیں،نہیں پیسے واپس آجائینگے مگر یہ سوچو کہ اگر وہ بھوک سے مر گئے تو میں روز قیامت اللہ کو کیا جواب دونگی اور ویسے بھی یہ اتنے پیسے تو ہیں نہیں کہ اس سے حج کیا جاسکے ابھی تو اکھٹے کر رہی ہوں اگر میں ان کی تھوڑی مدد کر دوں گی تو شاید اللہ تعالیٰ میری اس قربانی کو دیکھ کر میری یہ حاجت پوری کر دیں" یمنیٰ نے کہا اور اسی وقت وہ ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر باہر کی طرف بھاگی، گلی میں آئی تو بوڑھا روتا ہوا جا رہا تھا۔

"باباجی!رکیں!" اس نے آواز لگائی۔

"باباجی! آپ کو کسی نے کچھ بھی نہیں دیا؟"

"بیٹا! نیچے دینے والے کے ہاتھ سے اوپر دینے والے کا ہاتھ بہتر ہے، ہائے، کاش! میں اوپر والے سے مانگ کر تو دیکھتا مجھے پکا یقین ہے وہ مجھے خالی ہاتھ نہ لوٹاتا، مگر افسوس کہ میں یہ کیسے بھول گیا، افسوس!" بوڑھا آہ بھر کر بولا اور رو پڑا۔

یمنیٰ نے وہ گلک جس میں اس نے حج کے لئے پیسے جمع کیئے تھے اپنے ہاتھوں سے اور بڑی خوشی کیساتھ اس بوڑھے کی طرف بڑھایا۔

"باباجی!اس میں کچھ رقم ہے آپ اس سے بچوں کے لیے کھانے کی چیزیں لے جائیں"

بوڑھے کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔وہ سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھ کر بولا۔

"دیکھا میں نے ابھی اپنے رب کو پکارا اور اس نے عطاء بھی کر دیا۔اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے آئندہ میں تجھ ہی سے مانگوں گا"

وہ بوڑھا ہاتھ اٹھا کر یمنیٰ کو دعائیں دیتا ہوا چل پڑا۔یمنیٰ کے دل میں ایک سکون سا اتر گیا۔وہ خوشی خوشی واپس آ گئی۔اسکے چھوٹے کزن منیر نے اسے گلک اٹھا کر باہر جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور اپنے بابا سے کہا کہ ابو وہ یمنیٰ باجی اپنا گلک فقیر بابا کو دینے لگی ہے گلک۔

"کیسا گلک؟" تو اس کی بڑی بہن اسماء نے کہا کہ یمنیٰ حج کرنا چاہتی تھی۔اسماء نے پوری بات والد صاحب کو بتادی۔

عابد اپنی اہلیہ کو دیکھنے لگا۔دونوں حیران تھے، تبھی یمنیٰ اندر داخل ہوئی۔ننھے منیر نے آگے بڑھ کر یمنیٰ کی انگلی پکڑ کر کہا۔

"یمنیٰ باجی! آپ نے وہ گلک فقیر بابا کو دے دیاناں؟" یہ سن کر یمنیٰ ڈرگئی وہ اپنے چچا اور چچی کو دیکھنے لگی۔

"بیٹا! آپ نے وہ رقم اسے کیوں دے

دی؟ آپ نے توجہ کرنا تھا ناں؟'' چچا عابد آگے بڑھے اور یمنیٰ کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''جی چاچو! مگر پیسوں کی انہیں زیادہ ضرورت تھی ابھی مجھے مزید 5 سال اور لگ جاتے پیسے اکھٹے کرنے میں۔ مگر سوچیئے! اگر انکی جان چلی جاتی تو؟ وہ تین دن سے بھوکے تھے بے چارے۔

چاچو! اگر کوئی سائل ہمارے دروازے پر آئے تو اسے خالی ہاتھ نہ لوٹائیں کیونکہ ہمارے پیارے نبی کریم ﷺ نے کبھی کسی سائل کو خالی ہاتھ نہ لوٹایا اگر کچھ نہ بھی ہوتا تو قرض لے کر انہیں دیتے۔ اپنی امت کو بھی یہ سکھا گئے کہ کسی مجبور اور بے بس کو خالی ہاتھ نہ لوٹائیں، ہم ان کے امتی ہیں۔ ہمیں آپ ﷺ کے نقشِ قدم پر چلنا ہے تبھی ہم کامیاب ہو سکتے ہیں۔

چاچو! اگر ہماری چھوٹی سی نیکی سے کسی کا بھلا ہو سکتا ہے تو ہم وہ نیکی کرنے میں کیوں گھبرائیں۔ اللہ تعالیٰ کسی کا احسان نہیں رکھتا، اللہ اس کا بدلہ ضرور دیگا۔

میں یہ سوچ کر ڈر گئی تھی چاچو کہ اگر کل حشر والے دن پیارے نبی کریم ﷺ سے سامنا ہو جاتا تو میں انہیں کیا جواب دیتی کہ ایک ضرورت مند امتی کو میں نے خالی ہاتھ لوٹا دیا۔'' عابد یمنیٰ کی باتیں سن کر کانپ گیا تھا اس نے یمنیٰ کو گلے سے لگا لیا۔

''شاباش بیٹا! شاباش! تم نے بالکل ٹھیک کہا۔ فکر نہ کرو اب میں خود تمہیں حج کرانے لے جاؤنگا، ان شاء اللہ، وعدہ ہے میرا تم سے'' چچا اور چچی آنسو بھری آنکھوں سے یمنیٰ کو مسکرا کر دیکھ رہے تھے۔

❁❁❁❁

رات ہو چکی تھی۔ یمنیٰ گہری نیند میں تھی۔ وہ خواب میں کیا دیکھتی ہے کہ وہ خانہ کعبہ کا طواف کر رہی ہے۔ وہ بے حد خوش ہے، تبھی اس کے کانوں میں کسی کی آواز گونجی۔

''یمنیٰ بلاشبہ تمہارا حج قبول ہوا۔ تمہارا حج قبول ہوا''

یہ سننا تھا کہ یمنیٰ کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بستر سے اٹھ بیٹھی یہ تو خواب تھا۔ اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا تو رات کے دو بج رہے تھے۔ وہ مسکرائی وہ خانہ کعبہ کی دیوار کے ساتھ لگی پینٹنگ کو دیکھ کر مسکرائی اور کہا:

''بلاشبہ اللہ تعالیٰ کسی کی نیکی کو ضائع نہیں کرتا۔ اللہ نے اسے خواب میں حج کروایا اور اب ان شاء اللہ حقیقت میں بھی وہ اسے اپنے گھر کی زیارت کروائے گا''

یہ سوچ کر وہ مسکرائی اور دوبارہ سوگئی۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے گھر کی زیارت نصیب فرمائے۔ آمین

❁❁❁❁

وہ دیکھ رہا تھا کہ دونوں اپنے اپنے ظاہری حسن پہ مطمئن ہیں اور ہر ایک یہی سمجھتی ہے کہ وہ سب زیادہ خوب صورت ہے۔ ایسے میں، مَیں کیا فیصلہ کروں۔



خوبصورت کون؟

محمد فیصل علی

جیلی فش اور سٹارفش نے اپنے سامنے لگے بڑے سے آئینے میں خود کو دیکھا اور پھر دیکھتی ہی چلی گئیں۔ وہ اپنی خوب صورتی کا بغور جائزہ لے رہی تھیں۔

''میں پورے سمندر میں سب سے زیادہ خوب صورت ہوں۔'' جیلی فش نے ناز سے کہا

''اور میں تو ہوں ہی ستارہ، میرا مقابلہ کون کر سکتا ہے؟'' سٹارفش نے مسکراہٹ بکھیری

''بالکل لیکن تم مجھ سے کم خوب صورت ہو۔'' جیلی فش نے منہ بنایا

''اور اس کا فیصلہ تم کرو گی؟'' سٹارفش نے تیز لہجے میں کہا

''میں تو نہیں البتہ یہ فیصلہ سمندر والے کریں گے۔''

جیلی فش نے مغرورانہ انداز میں کہا اور پانی میں ادھر ادھر تیرنے لگی۔

وہ دونوں اگرچہ اچھی سہیلیاں تھیں مگر اس وقت خود کو سب سے زیادہ خوب صورت قرار دینے کے چکر میں ایک دوسرے سے دور ہوتی چلی جا رہی تھیں۔ ان کے دل میلے ہو چکے تھے اور دلوں پر کدورت چھا چکی تھی۔

''تو چلو کسی کو منصف بنا لیتے ہیں، فیصلہ کرا لیتے ہیں۔''

سٹار فش نے تجویز دیتے ہوئے کہا۔

''تو چلو چلتے ہیں کالو کچھوے کے گھر۔''

جیلی فش نے کہا اور وہ دونوں اس سمت تیرنے لگیں۔

❁❁❁❁

کالو کچھوے نے ان دونوں کی باتیں غور سے سنیں اور پھر دھیمی آواز میں بولا:

''سب سے زیادہ خوب صورت ہونے سے کیا فائدہ مل جائے گا؟''

''کوئی خاص نہیں۔''

جیلی فش اور سٹار فش ایک ساتھ بولیں۔

''تو پھر؟''

کچھوے نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

''بس حقیقت تو سامنے آجائے گی ناں؟''

جیلی فش نے کچھ سوچ کر کہا۔

''یہی تو میں بھی چاہتی ہوں۔''

سٹار فش نے بھی مطمئن انداز میں کہا۔

کچھوا سوچ میں پڑ گیا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ دونوں اپنے اپنے ظاہری حسن پہ مطمئن ہیں اور ہر ایک یہی سمجھتی ہے کہ وہ سب زیادہ خوب صورت ہے۔ ایسے میں مَیں کیا فیصلہ کروں۔ کچھوا کچھ دیر چپ چاپ بیٹھا رہا پھر اچانک وہ چونکا جیسے اسے کچھ یاد آگیا ہو، اس نے جوش بھرے لہجے میں کہا

''مجھے تمہارے مسئلے کا حل مل گیا۔''

''ارے واہ! مگر کیسے؟ کیا کرنا ہوگا ہمیں؟''

دونوں چونکیں۔

''مجھے ایسا طریقہ مل گیا ہے جس سے ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ سب سے زیادہ خوب صورت کون ہے۔''

''اوہ اچھا، جلدی بتاؤ پھر۔''

جیلی فش نے بے تابی سے کہا۔

کچھوے نے پہلے تو سر کھجایا پھر وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ اس دوران اس نے ایک خوب صورت سا سیب اٹھایا اور کہنے لگا:

''یہ میرے ہاتھ میں ایک سیب ہے۔ دیکھ رہی ہو نا؟''

''ہاں ہاں صاف نظر آ رہا ہے مگر اس کا کیا مطلب؟ مم۔۔میں سمجھی نہیں۔''

سٹار فش نے نہ سمجھنے والے انداز میں کہا اور

جیلی فش کو دیکھا۔وہ بھی نفی میں سر ہلا رہی تھی۔گویا اسے بھی سمجھ نہیں آئی تھی۔

''صبر کرو میں سمجھاتا ہوں۔یہ سیب ظاہری طور پر بہت خوب صورت ہے۔اگر یہ اندر سے گلا سڑا ہوا ہو تو کیا اس کی ظاہری خوب صورتی کسی کام آئے گی؟ کیا ہم اسے کھائیں گے؟''

کچھوے نے سیب کو ہاتھ میں گھماتے ہوئے کہا اور پھر اس نے سیب کو دو حصوں میں توڑ ڈالا۔جیلی فش اور سٹار فش نے دیکھا،سیب اندر سے گلا سڑا ہوا تھا۔

''اوہ اوہ!'' وہ چونک گئیں۔

اب کچھوے نے مٹی کا ایک پرانا سا برتن اٹھایا۔یہ صراحی کی طرح کا برتن تھا۔اس پہ سبز کائی جمی ہوئی تھی اور وہ بظاہر بہت بھدا سا لگ رہا تھا۔اب وہ گویا ہوا:

''اب اسے دیکھو،یہ ظاہری طور پر خوب صورت نہیں ہے،بلکہ کافی بدہیئت ہے،لیکن اس کے اندر میں نے اپنی اشرفیاں رکھی ہوئی ہیں۔تمہارے خیال میں اس کی اہمیت زیادہ ہے یا اس سیب کی؟''

''ظاہر ہے اسی برتن کی اہمیت ہے،جس میں یہ اشرفیاں ہیں۔اس سیب کا بھلا کیا فائدہ جو صرف ظاہری طور پر خوب صورت ہے۔''

جیلی فش نے منہ بنا کر کہا۔

''بالکل درست! تو پھر ایسی ظاہری خوب صورتی کا کیا فائدہ جس کی وجہ سے ہمارا باطن گل سڑ جائے اور ہم تکبر کا شکار ہو جائیں۔ہمیں ظاہری سراپے کے ساتھ ساتھ باطنی سراپے کی بھی فکر کرنی چاہیے۔اپنے ظاہر پر اکتفا نہ کرو بلکہ باطن کی بھی فکر کرو!''

''اوہ!اوہ!اب سمجھی ہیں ہم۔''

دونوں کے منہ سے نکلا۔ان کے چہروں پر حیرت کا ایک رنگ آ کر گزر گیا تھا۔

کچھوا مسکرایا اور بولا:

''تو پھر صرف ظاہر کے پیچھے نہ پڑو،ظاہر کے ساتھ ساتھ باطن پہ بھی محنت و کوشش کرو۔

ہمارے پیارے نبی حضرت **محمد** ﷺ نے ہمیں تعلیم دی کہ جب ہم خود کو آئینے میں دیکھیں تو یہ دعا پڑھیں:

''اے اللہ جس طرح تو نے میری شکل وصورت اچھی بنائی ویسے ہی میرے اخلاق بھی اچھے بنا دے۔''

کچھوے کی بات سن کر وہ سر ہلانے لگیں۔

اس شام دونوں آئینہ دیکھتے ہوئے زیر لب یہ دعا پڑھ رہی تھیں:

''اَللّٰهُمَّ أَنْتَ حَسَّنْتَ خَلْقِيْ فَحَسِّنْ خُلُقِيْ''

❀❀❀❀

جانباز کے نام

"نین۔۔! کہاں ہو تم؟"

میں نے آنکھیں بند کر کے اپنے "ہوائی گھوڑے" کو پکارا۔ وہ پچھلے کئی دنوں سے غائب تھا۔ "پری ملک" کا جاسوس نین گھوڑا۔

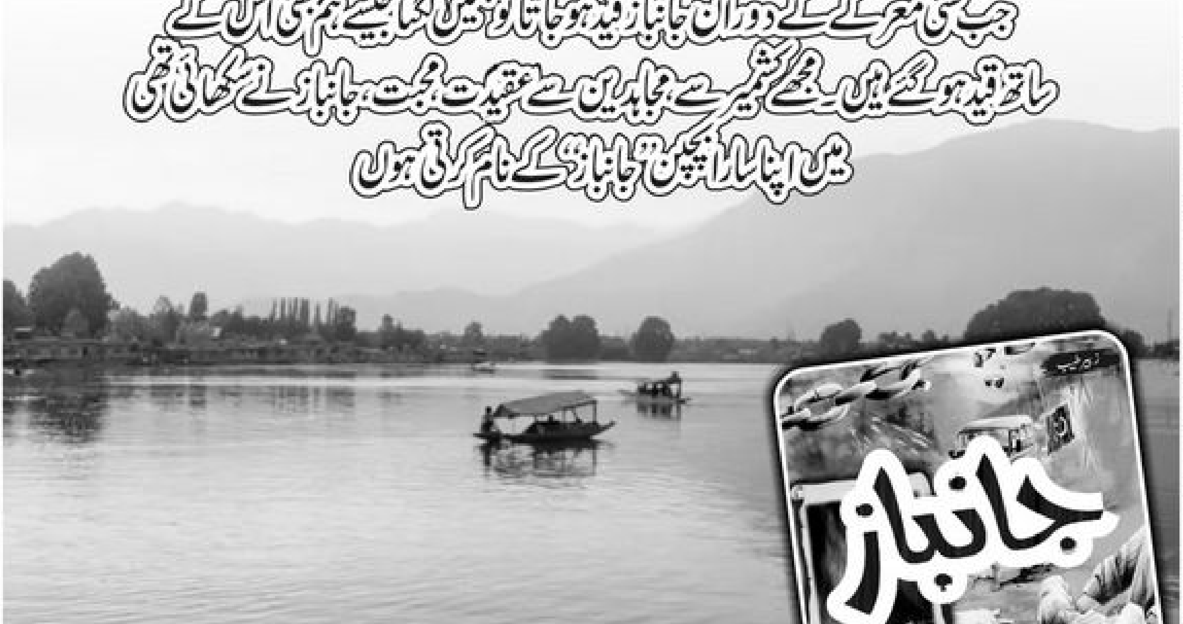
"نین! کیا تم سن رہے ہو؟" میں نے دانت پیسے۔

پری ملک کے سارے خادم اس وقت میرے سامنے تھے۔ مالی، باورچی، سپاہی، مگر نین غائب تھا۔

"ملکہ عالیہ! آپ نین کی وجہ سے پریشان مت ہوں۔ ہم سب آپ کے ساتھ ہیں۔" ننھی تتلی نے آنکھیں پٹپٹا کر معصومیت سے کہا۔

اس وسیع و عریض پری ملک میں پریاں ہنسی خوشی رہ رہی تھیں اور میں اس پری ملک کی ملکہ

جب کسی معرکے کے دوران جانباز قید ہو جاتا تو ہمیں لگتا جیسے ہم بھی اس کے ساتھ قید ہو گئے ہیں۔ مجھے کشمیر سے، مجاہدین سے عقیدت، محبت، جانباز نے سکھائی تھی میں اپنا سارا بچپن "جانباز" کے نام کرتی ہوں



رومان رشید کے قلم سے

تھی ملکہ عالیہ۔

میں سرخ باغ میں کھڑی تھی، میں نے اپنی سنہری چھڑی گھما کر آنکھیں بند کیں۔

”نین!!! ایک بار آؤ تو سہی، دیکھنا تمہارا کیا حشر کرتی ہوں۔“

”ملکہ! کیا ہوا نین کو؟“

مجھے اپنی سہیلی بیسٹ کی آواز سنائی دی تھی۔

میں نے بند آنکھیں کھول کر آسمان کی طرف دیکھا۔وہ ادھر ہی آرہی تھی۔

بیسٹ کے ہاتھوں میں جامنی چھڑی تھی وہ اپنے سہنری ”پر“ کھولے اڑتے ہوئے سرخ باغ کی طرف آرہی تھی۔

وہ میرے ساتھ کھڑی ہوگئی تھی۔ چہرے پر خوف تھا۔

ملکہ! نین پری ملک کا تجربہ کار جاسوس ہے۔ اگر وہ غائب ہے تو اسکا مطلب وہ قید ہو چکا ہے۔“

بیسٹ نے کہا، میرے پیروں تلے سے زمین سرکی تھی۔۔۔قید۔؟

نین کے قید ہونے کا مطلب مجھے معلوم تھا۔

پری ملک اور میری رعایا خطرے میں تھی۔

”محل اعلیٰ سے خطرے کے سائرن بجنے کی آواز سنائی دی۔

”پری ملک خطرے میں ہے بیسٹ! ہمیں محل جانا چاہئے“ یہ کہتے ہوئے میں نے چھڑی گھمائی۔

تھوڑی دیر بعد میں اور ”بیسٹ“ دربار عالی میں تھیں۔

محل اعلیٰ بادلوں پر بنا ہوا تھا۔ چوکیدار بھی بادل ہی تھے۔

اگر کوئی دشمن محل میں داخل ہونے کی کوشش بھی کرتا تو بادل اس پر بجلی پھینکتے، وہ جل کر راکھ ہو جاتا تھا۔

محل اعلیٰ اس وقت کھچا کھچ پریوں، تتلیوں اور ہوائی گھوڑوں سے بھرا ہوا تھا۔

”ملکہ عالیہ! کیا میں آپ سے کچھ کہہ سکتی ہوں؟“ ننھی تتلی نے گھبرا کر کہا۔

”تم کچھ بھی کہہ سکتی ہو ننھی تتلی!“ میں نے نرمی سے کہا۔

”آپ! جادوئی آئینے کو بلا کر اس سے نین کے بارے میں پوچھئے۔

ننھی تتلی نے کہا تو میں نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔

”جادوئی آئینے کو پیش کیا جائے۔“

”جو آپ کا حکم ملکہ!“ آئن گھوڑے نے منتر پڑھتے ہوئے چٹکی بجائی، اگلے ہی لمحے ایک آئینہ نمودار ہوا تھا۔

”میں ملکہ عالیہ کی خدمت میں سلام عرض کرتا ہوں۔میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟“ آئینے نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

”اففف! یہ کاہل، سست، کام چور آئینہ

ہماری کیا مدد کرے گا؟''بیسٹ نے میرے کان میں سرگوشی کی۔

''کیا تم پری ملک کے جاسوس نین گھوڑے کے بارے میں بتا سکتے ہو؟''

''نین گھوڑا؟ اچھا وہی جو آپ کی اس سہیلی بیسٹ کا ہم شکل ہے؟''

بیسٹ نے تلملا کر آئینے کو گھورا۔

''تم بتا رہے ہو یا نہیں، میں چلائی، دل کر رہا ہے کہ تمہیں یہیں پتھر کا بت بنا دوں۔''

''کم بخت آئینہ!''بیسٹ بڑبڑائی۔

آئینہ ڈھٹائی سے مسکرایا۔

''ملکہ عالیہ! آپ کی دشمن شپٹاقی جادوگرنی کافی طاقتور ہو چکی ہے۔سنا ہے کہ اس نے ہمارے ہمسایہ ممالک برستان اور دیو ملک پر قبضہ کر لیا ہے اور اب اسکا ملک پری ملک پر قبضہ کرنا چاہتا ہے، تکلیف کے لئے معذرت''یہ کہہ کر آئینہ غائب ہو گیا تھا۔

''کیا؟''سب چیخ اٹھے تھے۔

''خاموش!''میں نے سنہری چھڑی گھما کر سب کو خاموش کیا۔

''شپٹاقی جادوگرنی بہت ظالم ہے ملکہ!''ننھی تتلی نے روتے ہوئے کہا۔

اگر شپٹاقی جادوگرنی نے نین کو گرفتار کر لیا ہے تو اسکا مطلب پری ملک کی ساری خفیہ معلومات وہ جان چکی ہے''بوڑھی پری نے اپنی نحیف آواز میں کہا تھا۔

''خفیہ معلومات''بیسٹ نے مجھے دیکھا۔

''کونسی معلومات ملکہ!''

''وہ نین تھوڑا چوکیدار بادلوں کو غلام بنانے کا منتر جانتا ہے۔''میں نے بمشکل کہا تھا۔

ننھی تتلیاں ڈرتے اپنے چھوٹے چھوٹے گھروں میں بھاگ گئی تھیں۔

''اب کیا ہو گا ملکہ عالیہ!''بیسٹ اپنی پتلی آواز میں چیخ اٹھی تھی۔

اسی لمحے محل اعلیٰ لرز اٹھا تھا۔جیسے زلزلہ آیا ہو۔سارے پری ملک میں اندھیرا چھا گیا تھا۔

مکروہ بھیانک قہقہہ دور دور تک سنائی دیا تھا۔بکھرے بال، لمبے دانت، لمبے ناخنوں والی بدصورت جادوگرنی میرے سامنے تھی۔

میری دشمن شپٹاقی جادوگرنی۔

آہ۔۔۔مجھے اپنا دل بند ہوتا محسوس ہوا تھا۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

''رومان! اٹھ جاؤ بیٹی!''پھپھو نے جھنجھوڑ کر مجھے اٹھایا۔

''میرا محل''، میں چیختے ہوئے اٹھ بیٹھی۔

''اف اللہ! کیا ہو گیا ہے رومان! ناشتہ کرو اور سکول جاؤ!''

تمہاری امی کافی غصہ ہو رہی تھیں۔

''سکول؟''میں نے حیران ہو کے پوچھا۔

''جی ہاں سکول''، پھپھو مسکرائی۔

''مگر میں تو ملکہ عالیہ ہوں اور آپ شاید بوڑھی پری ہیں''

''کیا؟ پھپھو کا مارے صدمے کے منہ کھل گیا۔

''تم نے مجھے بوڑھی کہا؟''

''ارے پھپھو! آپ خود ہی تو کہتی رہتی ہیں کہ میں ساٹھ سالہ بیوہ بڑھیا۔ اب میں نے آپ کو بوڑھی پری کہہ دیا تو کیا ہوگیا۔ اگر آپ نے میری شان میں گستاخی کی تو آپ کو پتھر کا بت بنادوں گی۔''

''ہوں! اب سمجھی! رومان صاحبہ نے پھر کوئی خواب دیکھا ہوگا اور یہ سب خواب ان کہانیوں کی وجہ سے آتے ہیں۔'' پھپھو نے کہانیوں سے بھری الماری کی طرف اشارہ کیا، اور کمرے سے باہر چلی گئیں۔

میں نے پاس پڑی کہانی اٹھائی، اس کے سرورق پہ چڑیل کی تصویر بنی تھی۔ جس کے منہ اور آنکھوں سے آگ نکل رہی تھی۔

''عمرو عیار اور خون آشام چڑیل''

میں نے دوسری کہانی اٹھائی، اس کے ٹائٹل پر ایک ہٹا کٹا پکی عمر کا آدمی اور چند چڑیلیں بنی ہوئی تھی۔

''ٹارزن چڑیلوں کے نرغے میں''

کہانیوں سے بھری الماری دیکھ کر دل کر رہا تھا کہ کوئی کہانی پڑھنے بیٹھ جاؤں مگر ناشتہ کرنا تھا اور سکول بھی جانا تھا۔

''کاش! بارش آجائے، اور سکول نہ جانا پڑے (ہر بچے کی معصوم خواہش) اسی دن میں نے بھی دعا مانگی تھی کہ یا اللہ بارش آجائے۔ مجھے اڑن قالین چاہیے، یا پھر اڑن طشتری مل جائے تو زیادہ اچھی بات ہے۔

دعا مانگ کر قبولیت کا سو فیصد یقین تھا۔

بچپن تھا معصومیت تھی، اللہ سے معاملات اچھے تھے۔

مجھے یقین تھا کہ جب میں سکول سے واپس آؤں گی تو ایک پری مجھے میری اچھائیوں کے بدلے میں اڑن قالین دے جائے گی۔

میں اپنے خوابوں خیالوں میں اڑن قالین پہ بیٹھ کے فضاؤں میں اڑتی پھرتی تھی۔

''خواب سچ نہیں ہوتے ملکہ عالیہ!''

رومان نے مسکرا کر کہانی رکھی اور ناشتہ کرنے باہر چل دی۔

❁ ---- ❁ ---- ❁

سکول سے واپس آکے ہوم ورک کیا۔ عصر کی نماز کے بعد کہانی پڑھنے بیٹھ گئی تھی۔

کہانی کے سرورق پہ عجیب وغریب مخلوق کی تصویر تھی۔ بہت بھیانک، جس کے منہ سے خون نکل رہا تھا۔

تصویر دیکھتے ہی میں سہم گئی تھی۔ یہ کہانی میرے بابا میرے لئے کل ہی لائے تھے اور ایک رسالہ بھی تھا بچوں کا باغ۔ میں نے کہانی

پڑھی۔جس میں کوئی بدروح نوجوان لڑکوں کا خون پی جاتی تھی۔پھر آخر میں حاتم طائی اور اسکا دوست ''ہوبو''ڈریکولا کا خاتمہ کرتے ہیں۔

افف میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ اس کہانی نے مجھے کتنا ڈرایا تھا۔واش روم تک بھی اکیلے نہیں جاتی تھی۔کیونکہ اکیلے جانے کی صورت میں ڈریکولا بھی آسکتا تھا اور وہ میرا خون پی جاتا۔ حالانکہ کہانی میں لکھا بھی ہے کہ ڈریکولا صاحب صرف نوجوان انیس سالہ لڑکوں کا خون نوش فرماتے تھے۔مگر ہمیں کون سمجھاتا بھئی۔ میں اندھیرے میں جانے سے ڈرنے لگ گئی تھی۔

عمروعیار کی کہانیاں اچھی لگتی تھی مگر عمرو لالچی تھا۔اس لئے وہ مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔دولت دیکھ کے اس کے منہ میں پانی آجاتا تھا۔ہاں اسکی زنبیل بری نہیں لگتی تھی۔

ٹارزن اور منکو کیساتھ جنگلات کی سیر اب بھی نہیں بھولتی۔بچپن ایک پرستان تھا، پریاں تھیں اور ہم،غم کا دور دور تک کوئی نشان نہ تھا۔

ایک دن میں نے نانی اماں کے کمرے میں ایک کہانی دیکھی، جو عام کہانیوں سے کافی موٹی تازی تھی، اس پہ جلی حروف سے ''مسلمان بچے'' لکھا ہوا تھا۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا تھا کہ ''مسلمان بچے'' رسالہ ہے کہانی نہیں۔

اس میں تو بہت سی کہانیاں تھیں، کچھ صفحات رنگین بھی تھے، کافی دیر تو آرٹ گیلری دیکھ کر مسکراتی رہی۔

سب سے پہلے میں جو کہانی پڑھی وہ تھی ''جانباز'' یہ وہ دور تھا جب مضمون سمجھ میں نہیں آتے تھے۔امیر المجاہدین کا مضمون بھی، اور اب صرف مضمون ہی اچھے لگتے ہیں، ہے نا حیرت کی بات۔ امیر المجاہدین جو دعائیں بتاتے ہیں وہ فوراً یاد کر لیتی ہوں۔خاص طور پر یہ دعا۔

''اللھم انی اسئلک من فجاۃ الخیر و اعوذبک من فجاۃ الشر''

اے اللہ میں آپ سے اچانک آنے والی بھلائی کا سوال کرتی ہوں اور اچانک آنے والے شر سے پناہ مانگتی ہوں۔

کتنی خوبصورت دعا ہے نا۔

میری بلکہ ہماری موسٹ فیورٹ سٹوری جانباز تھی۔

جانباز عمروعیار اور ٹارزن کی طرح ماورائی کردار نہیں تھا۔ایک چھوٹا لڑکا،جسکے اپنوں کو بے دردی سے شہید کر دیا گیا تھا۔اس دن میں نے زندگی کو ایک اور رخ سے دیکھا تھا۔

حقیقت اپنا آپ منوا لیتی ہے۔اڑنے والا قالین،کوہ قاف اور پرستان بہت پیچھے رہ گئے تھے،ہم سب بہت شوق سے پڑھتے تھے۔

دو ہزار تیرہ کے بعد دل و دماغ پہ صرف جانباز کا قبضہ تھا۔کبھی یہ خیال چھو کر بھی نہ گزرا تھا کہ جانباز ایک تخیلاتی کہانی ہے۔ ویسے مجاہد بھی تو

جانباز ہی ہوتے ہیں۔جیسے ابوامامہ بھائی اوران جیسے دوسرے جانباز جنہوں نے میدان جہاد میں اپنا خون پسینہ ایک کیا ہو۔

۔۔۔۔۔۔

میں ''جانباز'' اپنے سے چھوٹے بچوں کو بھی سناتی تھی، میں شروع سے ہی قصہ گوتھی۔(اب بھی ہوں) جانباز کے کارنامے بڑھ چڑھا کر سناتی تھی۔ہاں اداس کرنے والی باتیں حذف کردیتی تھی۔جیسے قید و بند کی صعوبتیں۔صرف جانباز قید نہیں ہوتا تھا۔ہم بھی اس کے ساتھ قید ہوتے تھے۔آہ، وہ کتنا خوبصورت دور تھا۔جب ایک قسط ختم ہوجاتی تھی تو بچے خوب شور مچاتے کہ ہمیں آگے سنائی جائے۔تب میں آگے بھی سناتی تھی۔اگر زبیر بھائی سن لیتے تو وہ بھی ہمیں ''داد'' دینے پہ مجبور ہوجاتے۔کیونکہ ہم جانباز کے ہاتھ میں جادوئی چھڑی تھما دیتے اور پیروں تلے اڑنے والا قالین۔

جاں باز کشمیر تو فتح کرلیتا تھا اور سب ہنسی خوشی رہنے لگ تھے، جانباز کی ہر قسط شاندار ہوتی تھی۔جب انڈین آرمی پاگلوں کی طرح جانباز کے پیچھے بھاگ رہی ہوتی تھی تو ہمیں ہمارے جانباز پر فخر ہوتا تھا مجھے یاد ہے ایک قسط لفظ ''اچانک'' پہ ختم ہوئی تھی،اور ہمارا دل پسلیاں توڑ کر باہر۔

اگر میں جانباز سے جڑی یادیں لکھنے بیٹھ جاؤں تو یہ ایک ''داستان'' بن جائے گی کبھی ختم نہ ہونے والی۔

جانباز پڑھتے پڑھتے ہم بڑے ہوگئے تھے

۔۔۔۔۔۔

ایک دن ''مسلمان بچے'' کا رسالہ میرے ہاتھوں میں آیا'' مسکرا کر سرورق دیکھا۔۔دیکھتے ہی مسکراہٹ غائب ہوگئی تھی۔لکھا تھا۔

''جانباز۔آخری قسط''

میں بے جان مجسمے کی طرح دیکھتی رہی۔ قوت گویائی سلب ہو چکی تھی۔۔۔کیونکہ ہم نے آخری قسط کا انتظار کیا ہی نہیں تھا۔

''راجیو شکلا'' ایڈوانی، کرپاڈ پا جیسے منحوس لوگوں کا خاتمہ ابھی باقی تھا اور کشمیر ابھی فتح نہیں ہوا تھا۔

دل کو دھکا سالگا۔

دھڑکتے دل کیساتھ، آخری قسط پڑھی۔ایسا کیسے ہوسکتا تھا؟

کاش میری سنہری چھڑی ہوتی،جسے گھماتے ہی کشمیر فتح ہوجاتا۔کشمیر ہمارا ہوجاتا اور مجھے یقین ہے کشمیر ہمارا بن جائے گا۔کیونکہ کچھ خواب،حقیقت بن جاتے ہیں۔بس تھوڑا انتظار کرنا پڑتا ہے۔

مجھے کشمیر سے، مجاہدین سے عقیدت، محبت، جانباز نے سکھائی تھی میں اپنا سارا بچپن ''جانباز'' کے نام کرتی ہوں (جسے ''شہید'' لکھتے ہوئے قلم ساتھ نہیں دے رہا)

۔۔۔۔۔۔



ترجمہ وترتیب: محمد توقیر

ایک عجیب دوا

قدیم عربی ادب سے ماخوذ

کیا ہو جب آپ کسی اشتہار میں ایک دن پڑھیں کہ یہاں دلوں کی مرمت اور علاج کیا جاتا ہے؟

بازار میں چلتے ہوئے میری توجہ ایک عجیب وغریب اشتہار نے کھینچ لی، جو ایک دوکان کے باہر آویزاں تھا اور اس پر لکھا ہوا تھا

''یہاں دِلوں کی مرمت اور علاج کیا جاتا ہے''

میں حیران ہو کر دوکان میں داخل ہوا تو ایک بوڑھے شخص نے مسکراتے ہوئے میرا استقبال کیا، اس نے شاید مجھے کئی بار وہ اشتہار پڑھتے اور حیران ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ مسکراتے ہوئے کہنے لگا:

''ہاں میں دلوں کی اصلاح اور علاج کرتا ہوں۔ یہاں وہی آتا ہے جس کا دل اس کے قابو میں نہ ہو''۔

پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا:

''تم ادھر ذرا میرے قریب تو آؤ''

اس نے اپنا دایاں کان عین میرے دل کے مقام پر رکھ دیا اور آنکھیں بند کرلیں جیسے غور سے کچھ سن رہا ہو۔

چند ثانیوں بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور مسکراتے ہوئے کہا:

''تمہارے دل کی دھڑکن میں معمولی سا خلل ہے۔ میرے بیٹے، تم گھبراؤ نہیں تمہارا علاج بہت آسان ہے اور تمہارے لیے دوا بہت معمولی مقدار کی تجویز کی ہے''

میں یہاں دلوں کا علاج ان کی نوعیت اور حالت کے حساب سے کرتا ہوں۔

مجھے اشتیاق ہوا اور پوچھ بیٹھا کہ کیا دلوں کی

بھی اقسام ہوتی ہیں؟

وہ مسکرایا اور کہنے لگا یہ ہمارا وراثتی علم ہے۔

میرے باپ نے جو کچھ میرے دادا سے سیکھا تھا وہ سب مجھے سکھا دیا تھا تو اس تجربے کے مطابق دنیا کے اندر دلوں کی اقسام کچھ اس طرح سے ہیں:

ایک وضاحتیں کرنے والا دل

اور ایک دل جو ذبح ہو چکا ہے

اور ایک نرم کومل دل

اور ایک عمیق دل

اور ایک جلتا ہوا دل

اور ایک غرق ہوتا ہوا دل

ایک ٹوٹا ہوا دل

ایک دلِ غمزدہ

ایک صحتمند دل

ایک اداس دل

اور ایک بیمار دل

ایک بے ہوش دل

اور ایک مضبوط دل

ایک زخمی دل

ایک مغرور دل

ایک دل بسمل

اور ایک مسرور دل

اور ایک لمبی فہرست ہے۔ بس تم پاکی بیان کرتے رہو اس مالک کی جو سب دلوں کو پھیرنے پر قادر مطلق پاک پروردگار ہے۔

میں نے اس سے کہا جناب!!

ایک تالاب آپکے پاس کچھ پوچھنے آیا اور آپ نے اسے ”ہزار دریاؤں میں بانٹ دیا“

وہ ہنس دیا اور مسلسل مسکراتا رہا۔ یہ ہنسی ایک دانا اور عارف شخص کی تھی۔

مجھ سے کہنے لگا:

”اے میرے بیٹے، گھبرانے اور پریشان ہونے کی چنداں ضرورت نہیں، میرے پاس آنے والے ایسے ہی متحیر آتے ہیں مگر میرے ایک نسخے سے ہی مطمئن واپس چلے جاتے ہیں۔“

جس نے بھی تھوڑی سی کوشش کی اور یہ نسخہ استعمال کیا تو اس کا دل اور وجود صحتمند ہو گیا سوائے اس کے جس کے متعلق آسمانوں سے کوئی اور فرمان آچکا ہو۔

مجھے وہ ذرا کاغذ اور قلم پکڑانا، میں تمھارے لیے نسخہ تجویز کرتا ہوں:

سنو میرے بیٹے، تمھارا رزق تقسیم ہو چکا ہے، جو کوشش سے تم حاصل کر سکتے ہو لہذا ضرورت سے زیادہ حاصل کرنے میں خود کو ہلکان مت کرو۔

تقدیر کا لکھا ناگزیر ہے، جو ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا، لہذا گھبرانے سے کچھ حاصل نہیں اور تمھارا رفیق عاجز و بے بس ہے، درحقیقت وہ تمھاری مدد نہیں کر سکتا، اس لیے دوستوں سے توقعات وابستہ کرنا ترک کردو۔ جو دشمنی کرتا ہے وہ کمزور ہوتا ہے، لہذا

دشمنوں کا سامنا بلاخوف خطر کرنا، ان سے ڈرنا مت!!

اپنے دل کو تین چیزوں سے پاک کرلو!!

(1) نفرت

(2) کینہ و بغض

(3) ریا کاری

اور اسے تین چیزوں سے مزین کرلو!!

(1) ایمانداری

(2) تقویٰ

(3) اخلاص

اور تین باتیں کبھی نہ بھولنا!!

(1) پروردگار کے حضور ادب سے سر تسلیم خم کرنا، رحمت العالمین ﷺ سے محبت کرنا۔

(2) خوشحالی اور مشکلات ہر حال میں رب العزت کا مستقل شکریہ ادا کرنا۔

(3) مخلوق کے حال کو اس کے خالق پر چھوڑ دو اور خود کو درست کرنے میں مشغول ہو جاؤ، نہ کہ دوسروں کو!!

تین چیزیں اپنے اندر پیدا کرلو!!

(1) ایک یاد رکھنے والی زبان

(2) برداشت کرنے والا صابر جسم

(3) سمجھنے اور جاننے والا عقلمند دماغ

اور تین چیزوں سے دور بھاگتے رہو!!

لوگوں میں بیٹھ کر دوسرے لوگوں کی باتیں کرنا

ایسے بیکار لوگوں میں بیٹھنا جو صرف باتیں کرتے ہوں وہ بھی دوسروں کے عیبوں کی، تو ایسے لوگوں سے بچتے رہنا کیونکہ گھروں میں غربت اور افلاس انہی کے ہاں ڈیرہ ڈالتی ہے جو اپنا وقت دوسروں کے معاملات میں دخل دینے، ٹوہ میں رہنے اور انکے معمولات کے متعلق باتیں کرتے ہوئے ضائع کرتے ہیں۔

اپنی دوا لے لو، بروقت کھا لینا اللہ آپ کو شفا بخشے گا!!

اوہ یا اللہ! میں نے یوں محسوس کیا جیسے میں دوبارہ پیدا ہوا ہوں۔ میں نے اس نسخے کو کھلے دل سے قبول کیا اور گھر چلا گیا، اس کے بعد میں نے ہر وقت اس نسخے کو اپنی آنکھوں کے سامنے رکھا اور ان نصیحتوں پر عمل کرتا رہا۔

اور واقعی مجھے آرام ملنا شروع ہو گیا اور میرے دل کی دھڑکن اعتدال میں آگئی۔

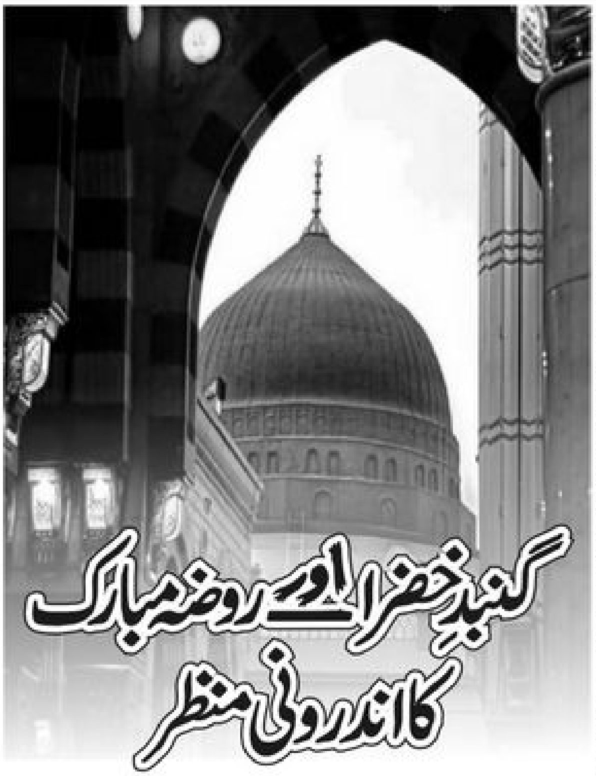
یہ زندگی گزارنے کا ایک ایسا طریقہ تھا، جس پر آپ جب عمل کرتے ہیں تو دل کو حیات نو ملتی ہے۔ روح فخر و انبساط سے بھر جاتی ہے اور آپ دل و جان سے خوش و خرم رہنا شروع ہو جاتے ہیں۔

(عمل کرنے سے ہو سکتا ہے میرے اور آپ کے دل کو شفاء مل جائے)

اللہ کریم تمام دلوں کے لیے آسمانوں سے شفاء نازل فرما۔ آمین

رازِ سربستہ

ابوشفاء



گنبدِ خضرا اور روضہ مبارک کا اندرونی منظر

سبز گنبد مسجدِ نبوی کی سب سے نمایاں تعمیرات میں سے ایک ہے۔ اسے نبی کریم ﷺ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کی قبروں کے اوپر بنایا گیا ہے۔

'جو سبز گنبد ہم آج دیکھتے ہیں وہ درحقیقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے کمرے کے اوپر موجود باہری گنبد ہے۔ اس کے اندر ایک اور گنبد ہے جو اس سے کہیں چھوٹا ہے اور اس پر پیغمبرِ اسلام ﷺ، حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے نام کندہ ہیں۔

علی بن احمد السمہودی اپنی کتاب وفاء الوفا میں لکھتے ہیں کہ

پیغمبرِ اسلام ﷺ کی قبر پر پہلا گنبد 650 سال کے بھی بعد بنایا گیا تھا اور سب سے پہلا گنبد 1279 (678 ہجری) میں سلطان قلاوون نے بنوایا تھا اور یہ لکڑی کا تھا۔

یہ نیچے سے چوکور اور اوپر سے آٹھ کونوں کی ساخت کا حامل تھا۔

روضہ اطہر پر بنایا گیا گنبد مملوک سلطان سیف الدین قلاوون کے دور 1279ء بمطابق 678ھ میں تعمیر کروایا گیا۔ اصل ساخت میں لکڑی استعمال کی گئی تھی۔ ہر نئے حکمران کی طرف سے بحالی کے کاموں کے دوران مختلف رنگ کئے جاتے رہے۔ 1481ء میں مسجد نبوی ﷺ میں آگ لگی، جس کے نتیجے میں گنبد بھی جل گیا۔ گنبد کی دوبارہ تعمیر کا کام مملوک سلطان قائتبائی نے شروع کیا۔ اس مرتبہ ایسے حادثات سے بچاؤ کیلئے لکڑی کے بجائے اینٹوں کا ڈھانچہ بنایا گیا اور لکڑی کے گنبد کی حفاظت کیلئے سیسہ کا استعمال کیا گیا۔

سولہویں صدی میں عثمانی سلطان سلیمان اعظم نے گنبد کو سیسے کی چادروں کے ساتھ مڑھوایا۔ پھر 1818ء میں عثمانی سلطان محمود بن عبدالحمیدؒ نے اسے سبز رنگ کروایا۔ اس کے بعد سے یہ ایسا ہی ہے۔ اسی سبز رنگ کی وجہ سے اسے "گنبد خضرا" اور "القبۃ الخضرا" (GreenDome) کہا جاتا ہے۔ یہ گنبد فنِ تعمیر کا ایک شاہکار ہونے کے ساتھ مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن ہے۔

1925ء میں جب آلِ سعود نے مدینہ

منورہ کو فتح کیا تو مقامی علماء کے حکم پر جنت البقیع میں قبور پر بنے تمام گنبد گرا دیئے گئے۔ کیونکہ شرعاً قبروں پر گنبد وغیرہ بنانا جائز نہیں ہے۔ پھر انہوں نے گنبد خضرا کے بھی انہدام کا ارادہ کیا۔ جس سے دنیا بھر کے مسلمانوں میں بے چینی پھیل گئی۔ مختلف ممالک کے علما نے انہیں منع کیا تو انہوں نے مناظرے کا چیلنج دیا۔ اس دوران ہندوستان سے بھی علما کا ایک وفد سعودی عرب پہنچا۔ شامی، عراقی اور ترک علما پہلے سے موجود تھے۔ تمام علما نے مناظرے کیلئے ہندوستانی وفد کے رکن علامہ شبیر احمد عثمانی ؒ کو آگے کر دیا۔ انہوں نے ناقابل تردید دلائل سے عرب علما کو قائل کرلیا کہ گنبد خضرا کو نہیں گرایا جا سکتا۔ یوں گنبد خضرا کے انہدام کا ارادہ ملتوی کر دیا گیا۔

گنبد خضریٰ کے نیچے دو حجرے موجود ہیں ایک حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور دوسرا حجرا مبارک حضرت فاطمہ الزاہرا رضی اللہ عنہا کا ہے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے حجرا مبارک کے اندر محراب بھی موجود ہے۔

دونوں حجرات کے اندر مختلف دیواریں ہیں جو کہ مختلف ادوار میں مسلم رہنماؤں کی جانب سے تعمیر کی گئی، ان دیواروں سے آگے جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ ان دیواروں سے آگے قباۃ النور (گنبد نور) موجود ہے جو کہ گنبد خضریٰ کے بالکل نیچے موجود ہے۔ جس میں گنبد خضریٰ کے



جیسی ایک کھڑکی موجود ہے کہا جاتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر انور تک جانے کا بس یہی ایک راستہ ہے۔

قباۃ النور کی کھڑکی کو کھولا جائے تو اس کے بعد سامنے وہی چھت نظر آتی ہے جو آپ ﷺ کے زمانے سے کھجور کے پتوں اور اونٹ کی کھال سے بنائی گئی ہے اور اس چھت مبارک کے نیچے آپ ﷺ کی قبر انور موجود ہے جہاں تک جانے کی کسی کو اجازت نہیں۔ قبر انور کو آخری دفعہ کنگ عبداللہ کے دور میں خدمت کیلئے کھولا گیا تھا۔

گنبد خضریٰ کا ماڈل متحف دارالمدینہ نامی میوزیم میں رکھا گیا ہے۔ جس طرح عام طور پر تصاویر سوشل میڈیا پر وائرل ہوجاتی ہیں کہ قبر انور پر عمامہ شریف رکھا گیا ہے وہ تمام تصاویر حقیقت سے دور ہیں۔ مسجد نبوی کا وہ حجرہ شریف جس میں



نبی اکرم ﷺ اور آپ کے دو اصحاب رضی اللہ عنہما کی قبریں ہیں، اس کے ارد گرد چہار دیواری ہے اسی سے متصل ایک اور دیوار ہے جو پانچ دیواروں پر مشتمل ہے۔ یہ پانچ کونوں والی دیوار حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ نے بنوائی تھی۔ اور اس کے پانچ کونے رکھنے کا مقصد اسے خانہ کعبہ کی مشابہت سے بچانا تھا۔ اس پنج دیواری کے گرد ایک اور پانچ دیواروں والی فصیل ہے۔ اس پانچ کونوں والی فصیل پر ایک بڑا سا پردہ یا غلاف ڈالا گیا ہے۔ یہ سب دیواریں بغیر دروازے کے ہیں، لہٰذا کسی کے ان دیواروں کے اندر جانے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ روضہ رسول ﷺ کی اندر سے زیارت کرنے والے بھی اس پانچ کونوں والی دیوار پر پڑے پردے تک ہی جا سکتے ہیں۔

روضہ رسول ﷺ پر سلام عرض کرنے والے عام زائرین جب سنہری جالیوں کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں تو جالیوں کے سوراخوں سے انہیں بس وہ پردہ ہی نظر آ سکتا ہے، جو حجرہ شریف کی پنج دیواری پر پڑا ہوا ہے۔ اس طرح سلام پیش کرنے والے زائرین اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی قبر اطہر کے درمیان گو کہ چند گز کا فاصلہ ہوتا ہے لیکن درمیان میں کل چار دیواریں حائل ہوتی ہیں۔

ایک سنہری جالیوں والی دیوار، دوسری پانچ کونوں والی دیوار، تیسری ایک اور پنج دیواری، اور چوتھی وہ چار دیواری جو کہ اصل حجرے کی دیوار تھی۔ گزشتہ تیرہ سو سال سے اس پنج دیواری حجرے کے اندر بھی کوئی نہیں جا سکا ہے سوائے دو مواقع کے۔

ایک بار 91 ہجری میں حضرت عمر بن عبد العزیز رحمتہ اللہ علیہ کے دور میں ان کا غلام اور دوسری بار 881 ہجری میں معروف مورخ علامہ نور الدین ابو الحسن السمہودی کے بیان کے مطابق وہ خود۔

مسجد نبوی میں قبلہ کا رخ جنوب کی جانب ہے۔ نبی پاک ﷺ کا روضہ مبارک ایک بڑے ہال کمرے میں ہے۔ بڑے ہال کمرے کے اندر جانے کا دروازہ مشرقی جانب ہے یعنی جنت البقیع کی سمت۔

بقیہ صفحہ 80 پر



حضرت مولانا محمد مسعود ازہر صاحب حفظہ اللہ

قدر دانی

اللہ تعالیٰ ہم سب کو ”نعمتوں“ کی قدر کرنے والا بنائے...... نعمتیں تو بہت لوگوں کو ملتی ہیں مگر ان کی ”قدر“ کوئی کوئی کرتا ہے...... اکثر لوگ تو بڑی بڑی ”نعمتوں“ کی ناقدری کر کے محروم ہو جاتے ہیں...... تھوڑا سا سوچیں! ایک عورت کے لئے وقت کے رسول اور نبی کی بیوی ہونے سے بڑھ کر کوئی نعمت ہو سکتی ہے؟...... اللہ اکبر کبیرا اتنی عظیم نعمت جس کی عظمت کا تصور بھی محال ہے...... نبی اور رسول کی تو چند لمحے کی زیارت ہی بہت بڑی نعمت ہے...... تو پھر دن رات کی رفاقت کا کیا مقام ہوگا؟...... اربوں کھربوں انسانوں میں سے اللہ تعالیٰ نے کم وبیش صرف ایک لاکھ چند ہزار افراد کو اپنی نبوت اور رسالت کے لئے منتخب فرمایا...... اللہ تعالیٰ کی مخلوق میں رسالت اور نبوت سے اونچا کوئی مقام نہیں ہے...... حضرت نوح علیہ الصلوٰۃ والسلام اللہ تعالیٰ کے بڑے رسول اور نبی

ہیں..... آپ کا شمار اولوالعزم پیغمبروں میں ہوتا ہے..... قرآن پاک میں جابجا آپ کا مبارک تذکرہ موجود ہے ..... اور ایک پوری سورۃ کا نام "سورۃ نوح" ہے..... اُس زمانے کی ایک عورت کو یہ عظیم نعمت ملی کہ وہ حضرت نوح علیہ السلام کے نکاح میں آئی..... مگر اُس ظالم نے "قدر" نہ کی..... استغفراللہ، استغفراللہ..... اتنی عظیم نعمت کی ناقدری..... اُس کے گھر میں "وحی" نازل ہو رہی تھی..... اُس کے سرتاج کی زیارت کو ملائکہ اُتر رہے تھے مگر وہ اپنی ادنیٰ خواہشات کی اسیر بنی رہی..... اُسے اپنی قوم اور برادری کا ناز اور خیال رہا اور وہ اصل نعمت کو بُھلا بیٹھی..... بالآخر کافر مری اور ہمیشہ ہمیشہ کے عذاب میں غرق ہوگئی..... بڑے خوف کا مقام ہے جی ہاں بڑے خوف کا..... قرآن پاک فرماتا ہے کہ کافروں کی مثال سمجھنی ہو تو حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیویوں کو دیکھو..... اللہ تعالیٰ نے اُن کو نعمت دی مگر انہوں نے ناقدری اور خیانت کی..... تب انبیاء علیہم السلام کے ساتھ رشتے داری بھی اُن کے کام نہ آئی..... یہ رشتہ داری کیسے کام آتی؟ انہوں نے کبھی اس رشتے کی قدر ہی نہیں کی..... اُن کی نظر میں وقتی مفادات تھے..... اور وہ

ہمیشہ ہمیشہ والی حقیقی زندگی کو بھول چکی تھیں..... اللہ، اللہ، اللہ..... اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو ہماری ماؤں پر..... اُمہات المؤمنین نے ایک بار خرچے میں اضافے کا مطالبہ کیا..... جی ہاں معمولی سا مطالبہ..... مگر اللہ تعالیٰ کو یہ پسند نہ آیا..... کیونکہ جو نعمت اُن خوش نصیب بیبیوں کو حاصل تھی..... خاتم النبیین حضرت محمد عربی ﷺ کی رفاقت کی نعمت..... اس نعمت کے ہوتے ہوئے عام دنیاوی نعمتوں کو سوچنا بھی اچھا نہیں تھا چنانچہ اعلان ہوگیا کہ..... دو چیزوں میں سے ایک چیز اختیار کرلو..... یا تو اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کو اختیار کرلو..... تب دنیا کی ہر خواہش اور زیب و زینت کو بُھلا دو..... یہاں کی آسائشوں کا خیال بھی نہ لاؤ..... اور اگر تمہیں دنیا کی آرائشیں چاہئیں..... تو پھر آقا مدنی ﷺ سے جدائی کے لئے تیار ہو جاؤ..... اللہ، اللہ، اللہ..... ہماری مقدس مائیں کانپ کر رہ گئیں..... رسول اقدس ﷺ سے جُدائی..... نہیں، نہیں، ہرگز نہیں..... خرچے کا مطالبہ بھی خواہشات کے لئے نہ تھا بس کچھ آسانی مطلوب تھی..... سب نے بیک آواز پکار کر کہا..... ہم اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ کو اختیار کرتی ہیں..... سبحان اللہ..... نعمت کی قدر کی تو ماشاء

اللہ کیسا مقام پایا...... کچے گھروں میں کھجور اور پانی پر گزارا کرنے والی ہماری مقدس مائیں آج کن نعمتوں میں ہیں...... کیا کوئی اس کا تصور بھی کر سکتا ہے؟...... اور جنت میں بھی وہ حضرت آقا مدنی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہوں گی...... ایک چچا کو اللہ تعالیٰ نے عظیم بھتیجا دیا مگر اُس نے قدر نہ کی...... وہ ابولہب آگ میں گیا...... اُس کی روح سارا دن اپنے لئے ہلاکت کا اعلان سنتی ہے...... تَبَّتْ یَدَا اَبِیْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ...... دوسرے چچا نے اپنے عظیم بھتیجے کی قدر کی...... وہ سید الشہداء سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ بن گئے...... اُن کا نام سنتے ہی انسان پر عجیب وجد طاری ہو جاتا ہے...... اللہ پاک مدینہ طیبہ لے جائے شہداء اُحد کے ہاں حاضری دیں تو جسم کے اندر خون کی گردش خود تیز ہو جاتی ہے...... سبحان اللہ! ہر مسلمان کو شہادت کی تمنا ہے اور شہیدوں کے سردار ہیں حضرت سیدنا حمزہ رضی اللہ عنہ...... سچی بات ہے بہت سے مسلمان آج بھی اُن کی زیارت کے لئے تڑپتے ہیں...... حضرت سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے بھی قدر فرمائی...... ماشاء اللہ خود بھی اونچے تھے...... خوب دراز قد، بنی ہاشم کے سردار...... اور مقام بھی کتنا اونچا پایا...... جو کوئی بھی حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے ساتھ اچھا سلوک کرتا تھا وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا محبوب بن جاتا...... حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں ایک بار قحط پڑا اور لوگ بارش کو ترس گئے...... حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو ساتھ لیا اور اُن کے وسیلے سے بارش کی دعا...... اللہ تعالیٰ سے مانگی...... اُن کی دعا کے بعد حضرت سیدنا عباس رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے...... آپ کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ برس رہے تھے...... آپ نے اپنے ہاتھ اٹھا کر دعاء مانگی...... تھوڑی ہی دیر میں منظر کچھ یوں تھا کہ لوگ بارش سے بچنے کے لئے بھاگ بھاگ کر دیواروں کی پناہ پکڑ رہے تھے...... اور حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے مبارک جسم کو محبت اور احترام سے چھوتے ہوئے کہہ رہے تھے...... ھنیا یا ساقی الحرمین...... اے حرمین کے ساقی مرحبا...... "حرمین کے ساقی"...... مکہ مکرمہ میں حُجّاج کرام کو زمزم پلانے کی خدمت بھی حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے پاس تھی...... اور آج مدینہ طیبہ کے باسی بھی آپ کی دعاء کی برکت سے سیراب ہو رہے تھے......

جی ہاں نعمت کی قدر انسان کو بہت اونچا کر دیتی ہے...... اس راز کو حضرت سیدنا عباس رضی اللہ عنہ نے خوب سمجھا...... علاقائی دستور اور قبائلی رواج کے مطابق تو بھتیجے کی پیروی کرنا ٹھیک نہیں تھا...... مگر جس کو اللہ تعالیٰ عقل عطاء فرمائے

وہ کبھی ان فضولیات کی خاطر بڑی نعمتوں سے محروم نہیں ہوتا...... پھر آگے دیکھیں! حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے اپنے صاحبزادے مفسر القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو عجیب نصیحت فرمائی...... جی ہاں ایک بڑی نعمت کی ''قدردانی'' کا طریقہ سکھلایا......ارشاد فرمایا:

''اے بیٹے میں دیکھ رہا ہوں کہ امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تمہیں بزرگ صحابہ پر بھی ترجیح دیتے ہیں پس (اس نعمت کی قدر کے لئے) پانچ باتوں کا خوب لحاظ رکھو

(۱) اُن کا راز کسی کے سامنے افشاء نہ کرنا

(۲) اُن کے سامنے کسی کی غیبت نہ کرنا

(۳) اُن سے جھوٹ نہ بولنا

(۴) کسی معاملے میں اُن کی نافرمانی نہ کرنا

(۵) اس کا خیال رکھنا کہ وہ تم سے کوئی خیانت نہ دیکھیں

امام شعبیؒ فرماتے ہیں کہ ان پانچوں باتوں میں سے ہر بات ہزار باتوں اور نصیحتوں پر بھاری ہے (احیاء علوم الدین)

اللہ تعالیٰ کسی بھی مسلمان کو اپنے کسی مقبول بندے کی صحبت، اعتماد اور قُرب عطاء فرمائے تو وہ ان پانچ باتوں کا خیال رکھے......تب وہ اس نعمت کی قدر کرنے والا ہوگا...... اور جو کسی نعمت کی قدر کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑے بڑے انعامات اور مقامات پاتا ہے......مگر شیطان کی بھرپور کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ ہمیں ناقدرا اور ناشُکرا بنادے...... شیطان خبیث ہمارا دشمن ہے اور اُسے ہماری ہر نیکی سے تکلیف ہوتی ہے......

تفسیر روح البیان میں اس پر ایک عجیب واقعہ لکھا ہے ...... حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں......ایک بار نبی کریم ﷺ مسجد کی طرف تشریف لے گئے تو آپ نے دیکھا کہ وہاں ابلیس موجود ہے...... آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تمہیں کیا چیز میری مسجد کے دروازے پر لائی ہے؟...... ابلیس نے کہا یا محمد! (ﷺ) مجھے اللہ تعالیٰ یہاں لایا ہے...... آپ ﷺ نے فرمایا کس لئے؟...... کہنے لگا! اس لئے تاکہ آپ جو چاہیں مجھ سے پوچھیں...... آپ ﷺ نے پہلی بات یہ پوچھی کہ...... اے ملعون! تم میری امت کو جماعت کے ساتھ نماز پڑھنے سے کیوں روکتے ہو؟ شیطان نے کہا اے محمد (ﷺ) جب آپ کی اُمت نماز کے لئے نکلتی ہے تو مجھے گرم بخار اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور جب تک وہ ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے یہ بخار میری جان نہیں چھوڑتا...... آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم میری اُمت کو علم اور دعاء سے کیوں روکتے ہو؟...... کہنے لگا جب آپ

کے اُمتی دعاء کرتے ہیں تو میں بہرا اور اندھا ہو جاتا ہوں اور اُس وقت تک ٹھیک نہیں ہوتا جب تک وہ ہٹ نہیں جاتے...... آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا! تم میری اُمت کو قرآن سے کیوں روکتے ہو؟...... اُس نے کہا...... جب یہ قراءت کرتے ہیں (یعنی قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہیں) تو میں سیسے کی طرح پگھلنے لگتا ہوں...... آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا تم میری امت کو جہاد سے کیوں روکتے ہو؟......شیطان نے کہا یہ جب جہاد پر نکلتے ہیں تو میرے پاؤں میں بیڑی ڈال دی جاتی ہے اور ان کے واپس آنے تک میں قید رہتا ہوں...... اور جب یہ حج کے لئے نکلتے ہیں تو ان کے واپس آنے تک میں زنجیروں اور طوقوں میں جکڑا رہتا ہوں اور جب یہ صدقہ کا ارادہ کرتے ہیں تو میرے سر پر آرا رکھ دیا جاتا ہے جو میرے سر کو یوں کاٹتا ہے جس طرح لکڑی کو چیرا جاتا ہے......(روح البیان، تفسیر حدائق الروح والریحان)

اللہ تعالیٰ کے کسی مقرب اور مقبول بندے کی صحبت اور رفاقت تو اُن تمام اعمال کا ذریعہ بنتی ہے جن اعمال سے شیطان کو تکلیف پہنچتی ہے...... اس لئے وہ پوری کوشش کرتا ہے کہ انسان سے یہ نعمت چھن جائے...... ابھی آخری زمانے میں اللہ تعالیٰ نے حضرت سید احمد شہیدؒ کو اُمت مسلمہ میں ایک عظیم مصلح اور مجدد کی صورت میں پیدا فرمایا...... اُن کے زمانے کے خوش نصیب لوگوں نے اس نعمت کو پہچان لیا اور پھر ہر قربانی دے کر اس نعمت کی قدر کی...... ان اہل وفا کی عجیب داستان ہے...... آج اہل علم اور اہل قلم جب بھی ایمان، عزیمت اور وفا کی داستان لکھنے بیٹھتے ہیں تو انہیں حضرات کو بطور حوالہ کے پیش کرتے ہیں......

حضرت سید صاحبؒ کی برکت سے دنیا میں ان حضرات کو ایمان، جہاد، جماعت اور شہادت کی نعمتیں ملیں...... اور شہادت کے بعد آخرت کی نعمتیں الگ اور دنیا میں نیکیوں اور دعاؤں کے سلسلے الگ...... اور وہ لوگ جنہوں نے وقتی مفادات کو سامنے رکھ کر اس نعمت کی ناقدری کی وہ بھی...... اپنے وقت سے زیادہ نہ جی سکے اور نہ اپنے مقدر سے زیادہ روزی پا سکے...... ہاں بہت سی سعادتیں اُن کے گھر کے آنگن میں اُتر کر پھر اُن سے روٹھ کر چلی گئیں...... آج یہ سب باتیں اچانک میرے ذہن میں...... ایک خط پڑھنے کے بعد آئیں...... یہ خط مجلس تحفظ ختم نبوت کے مرکزی نائب امیر......اور اکابر کی صحبتوں سے منجھے ہوئے ایک بڑے بزرگ عالم دین کا ہے......

حضرت اقدس ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر مدظلہ العالی......حضرت اقدس بنوریؒ کے خاص شاگرد

اور معتمد...... اور آج مسند بنوریؒ کے تاجدار...... حضرت بنوریؒ نے اُن کو "عصائے بنوریؒ" کا لقب دیا...... نامور عربی ادیب اور دلکش، شائستہ مزاج کے حامل، شفیق استاذ...... میری سعادت ہے کہ اُن سے نحو میر بھی پڑھی...... اور پھر مشکوٰۃ شریف کا ایک حصہ بھی...... اُن کا یہ عمومی خط حضرت مولانا سعید احمد جلالپوری شہیدؒ کے بارے میں مضمون لکھنے کے حکم پر مشتمل ہے...... حضرت مولانا سعید احمد جلالپوریؒ کا نام پڑھا تو میرا ذہن...... نعمت اور اُس کی قدر کے موضوع پر سوچنے لگا...... ہم نے مولانا سعید احمد جلالپوریؒ کو اُس زمانے میں بھی دیکھا جب ماشاء اللہ بالکل نوجوان تھے...... قسمت کی خوبی دیکھیں کہ ان کی تشکیل حضرت لدھیانوی شہیدؒ کے ساتھ بطور معاون ہوگئی...... وہ ماہنامہ بینات کے دفتر میں حضرت لدھیانویؒ کے دائیں طرف بیٹھے رہتے تھے اور حضرت جو کتاب طلب فرماتے وہ نہایت پھرتی کے ساتھ تیزی سے اٹھا کر حضرت کو پیش کر دیتے...... اُس وقت نہ وہ خود مضامین لکھتے تھے اور نہ تصنیف و تدریس سے کوئی خاص رشتہ تھا...... مگر اُن کو "پارس" کی صحبت مل گئی تھی...... اُن کی قسمت اچھی تھی انہوں نے اس صحبت کی قدر اور حفاظت کی...... اور ہر طرح کے حالات میں حضرت سے چمٹے رہے...... استقامت اور وفا بڑی چیز ہے...... یہ انسان پر ترقی کے تمام دروازے کھول دیتی ہے...... حضرت لدھیانویؒ کی قدر کرنے پر اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا سعید احمد جلالپوریؒ کو ماشاء اللہ خوب نوازا...... اُن سے علمی اور تحریری میدان میں کافی کام لیا...... اور بالآخر اُن کو حضرت لدھیانوی شہیدؒ کے قائم فرمودہ "ادارے" مزارِ شہداء میں بھی جگہ مل گئی...... اللہ تعالیٰ اُن کے درجات بلند فرمائے...... اور اللہ تعالیٰ ہمیں بھی حقیقی نعمتوں کی "قدردانی" نصیب فرمائے...... آمین یا ارحم الراحمین

اللھم صل علی سیدنا و مولانا محمد وعلی الہ وصحبہ وبارک وسلم تسلیما کثیرا کثیرا......

کوپن برائے "وہ کون تھا؟"

نام: ....

ولدیت: ....

مکمل ایڈریس: ....

تعلیم: ....

جواب: ....

ہدایات: (انعام بذریعہ قرعہ اندازی دیا جائے گا اور ایک کوپن ایک ہی ساتھی کی طرف سے قبول کیا جائے گا اور جواب بغیر کوپن کے قبول نہیں کیا جائے گا)



خوشی کی بات

امن ارشد، سیالکوٹ

"بابا! آج ہم بکرا لینے جائیں گے ناں؟" فرحان نے اپنے ابو سے سوال کیا۔

"جی بیٹا! ان شاء اللہ ضرور" بابا نے مختصر انداز میں اپنا ارادہ ظاہر کر دیا۔

فرحان ظہر کی نماز پڑھ کر مسجد سے واپس آیا اور ٹکٹکی باندھے گھڑی کو دیکھنے بیٹھ گیا۔

گھڑی کی طرف یکسوئی اختیار کرنے کی وجہ سے وہ چند ہی ثانیوں میں نیند کی وادیوں میں ڈوب چکا تھا۔

"اٹھو بیٹا! اٹھو!" فرحان کی امی اس کے بازو کو ہلاتے ہوئے پکار رہی تھیں۔

فرحان نے آنکھیں ملتے ہوئے گھڑی کی طرف نظریں دوڑائیں تو گھڑی کی سوئی پانچ کا ہندسہ پار کر چکی تھی۔

اس نے غسل کیا، نماز ادا کی اور صحن میں آکر امی کے پاس بیٹھ گیا۔

کچھ ہی دیر کے بعد ابو، فرحان کو پکارتے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔

"بیٹا! جلدی سے گاڑی میں بیٹھ جاؤ! میں کپڑے تبدیل کر کے آتا ہوں۔" بابا حکم صادر کرتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔

کچھ دیر کے بعد بابا کمرے سے باہر آئے اور مویشی منڈی کی طرف روانہ ہو گئے۔

عشاء کی نماز کے قریب انہوں نے ایک اونچے قد والا بکرا خرید لیا تھا، جس کا رنگ سفید تھا اور جسم میں سیاہ دھاریاں اس کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہی تھیں۔

بکرا گھر آیا تو سب گھر والے اس کے ارد گرد دائرہ بنا کر جمع ہو گئے۔

"اس کو چارہ میں کھلایا کروں گی۔"

مریم آپی گویا ہوئیں۔

’’نہیں نہیں، میں کھلایا کروں گا۔ یہ میرا بکرا ہے۔‘‘ عرفان نے بھی اپنا موقف پیش کر دیا تھا۔

’’بیٹا دونوں مل کر کھلا لینا۔‘‘ امی جان نے مسئلہ کا اتفاقی حل تجویز کیا۔

اب فرحان روزانہ اس کو چارہ کھلاتا اور اپنا اکثر وقت اس کے ساتھ گزارتا۔ وہ بکرے کے ساتھ بہت مانوس ہو چکا تھا۔

ایک دن اس نے بابا کو یہ بات کہتے ہوئے سن لیا، جب وہ چچا جان کے ساتھ گفتگو کر رہے تھے کہ عید والے دن کافی مہمان آتے ہیں، اس لیے ہم عید کی نماز کے فوراً بعد ہی بکرے کو ذبح کروالیں گے تاکہ تقسیم کا عمل بھی جلد از جلد ہو سکے۔

اس دن سے فرحان کے چہرے پر یاسیت کے آثار نمایاں ہو گئے، جن کو امی جان نے محسوس کر لیا تھا۔

’’فرحان! اتنے پریشان کیوں ہو؟‘‘ امی نے استفسار کیا۔

فرحان نے امی کے کندھے پر سر رکھا اور آنسوؤں کا بند توڑ دیا، جیسے وہ اسی ایک کندھے کا منتظر تھا۔

’’امی جان! میں نہیں چاہتا کہ بکرا ذبح ہو۔ وہ میرا اتنا اچھا دوست بن چکا ہے۔‘‘ فرحان نے مایوسی کی وجہ بیان کی۔

’’بیٹا! آپ کو پتا ہے کہ ہم لوگ عید کے موقع پر قربانی کیوں کرتے ہیں؟‘‘

’’نہیں امی جان!‘‘ فرحان نے جھٹ سے جواب دیا۔

’’حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللّٰہ کے حکم کے سامنے اپنا سر خم کر دیا اور اسماعیل علیہ السلام کو قربان کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔‘‘ امی جان نے قربانی کرنے کی وجہ کو بیان کیا۔

’’امی جان! پھر کیا ہوا؟‘‘ فرحان نے بڑے اشتیاق سے سوال پوچھا۔

’’بس بیٹا! اللّٰہ تعالیٰ تو بندے کو آزماتے ہیں۔ اللّٰہ نے مینڈھا نازل فرما دیا اور بیٹے کی جگہ وہ قربان ہو گیا۔‘‘

’’امی جان! اگر وہ بیٹے کو قربان کر دیتے، تو کیا ہوتا؟‘‘ فرحان کے چہرے پر سنجیدگی تھی۔

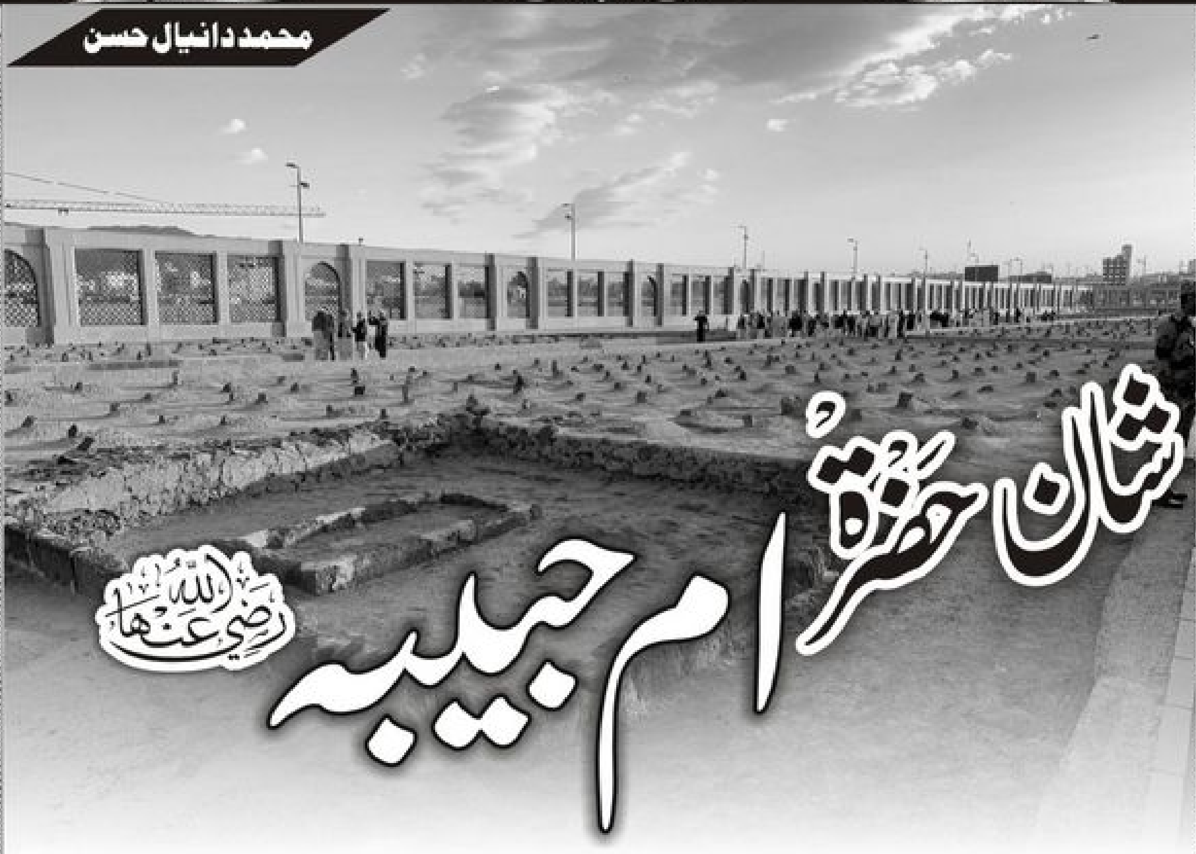
’’اگر وہ قربان کر دیتے تو آج ہمیں بھی ہر سال اپنا ایک بیٹا قربان کرنا پڑتا۔‘‘ امی نے مختصر جواب میں اللّٰہ تعالیٰ کی حکمت عملی سے روشناس کروایا تھا۔

’’اس لیے یہ غمگین ہونے کی بات نہیں ہے بلکہ خوشی کی بات ہے کہ ہمارا قربان کیا ہوا بکرا اللّٰہ کی بارگاہ میں پیش ہوگا۔‘‘

عید والے دن فرحان نے بکرا ذبح کروانے میں بھی مدد کی اور تقسیم کا عمل بھی خوشی اور مسرت کے ساتھ سرانجام دیا۔

❀❀❀

محمد دانیال حسن



شانِ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا

آج اتوار ہے اور سب بچے نانی اماں کے پاس مقررہ وقت پر جمع ہو چکے ہیں۔

رمضان المبارک گزر چکا ہے تو نانی اماں نے پہلے بچوں کو فلسفہ عید کی اہمیت و فضیلت بتائی، جس کے بعد نانی اماں نے پوچھا۔

”ہاں بھئی بچو! امید ہے تمہیں پچھلی نشست کا اختتام یاد ہوگا۔ ہم امہات المومنین کے شاندار سلسلے کو پڑھ رہے ہیں اور اب ہم ام المومنین حضرت ام حبیبہؓ کے بارے میں جانیں گے۔سب بچوں نے پرجوش ہو کر جواب دیا۔

”جی! ہاں ہم تیار ہیں۔“

تو نانی اماں نے بولنا شروع کیا۔

”تو سنو! ام المومنین سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا ازواج مطہرات میں دسواں نمبر ہے۔ آپ بڑی نیک سیرت، نیک صورت اور بڑی راسخ العقیدہ خاتون تھیں۔ آپ عالی نسب، عالی ہمت، بلند طبیعت اور پاکیزہ صفات کی مالکہ تھیں۔ آپ کو قدیم الاسلام ہونے کا بھی شرف حاصل ہے۔“

نائلہ اب تم ہمیں حضرت حبیبہ رضی اللہ عنہا کے نام ونسب کے بارے میں بتاؤ؟

نائلہ نے جواب دیا۔

”آپ رضی اللہ عنہا کا نام رملہ یا ہند اور کنیت ام حبیبہ ہے۔ والد کا نام ابوسفیان اور آپ رضی اللہ عنہا کی والدہ کا نام صفیہ بنت ابی العاص تھا۔ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلان نبوت سے 17 سال قبل مکہ میں مکہ کے رئیس ابو سفیان (رضی اللہ عنہ) کے گھر پیدا ہوئیں۔“

عائشہ یہ بتاؤ، کیا حضور ﷺ سے پہلے سیدہ ام

حبیبہ رضی اللہ عنہا نے کوئی نکاح کیا؟

اب باری عائشہ کی تھی۔وہ بولی۔

''ام المومنین سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا چونکہ رئیس قریش ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بیٹی تھیں۔اس لیے انہوں نے بڑے ناز و نعم کے ساتھ پرورش پائی۔جب جوان ہوئیں تو اپنی قوم کے حلیف عبید اللہ بن جحش سے ان کا نکاح ہوا۔عبید اللہ اور سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے ابتدائی زمانہ اسلام میں ہی اسلام قبول کرلیا۔جب کفار مکہ اور سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے والد ابوسفیان (رضی اللہ عنہ) کی اذیتیں حد سے تجاوز کرگئیں تو ان دونوں میاں بیوی نے حبشہ کی طرف ہجرت کی۔

حبشہ میں ہی ان کے ہاں ایک بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام حبیبہ رکھا گیا۔ام المومنین سیدہ رضی اللہ عنہا اسی وجہ سے ام حبیبہ کے نام سے مشہور ہوئی اور ان کا اصل نام کنیت کے نیچے دب گیا۔

شاباش عائشہ! حسان! تم ہمیں اب اس سے آگے بتاؤ گے کہ ام المومنین سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح میں داخل ہوئیں؟

اب حسان نے بولنا شروع کیا۔

''ام المومنین سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا اس جماعت میں شامل ہیں جنہوں نے ابتدائی زمانہ میں ہی اسلام قبول کرلیا تھا اور کفار و مشرکین کی اذیتیں برداشت کی تھیں۔آپ رضی اللہ عنہا نے اسلام کی خاطر اپنے والدین، بہن، بھائی، عزیز واقارب اور وطن تک کو چھوڑ دیا تھا۔آپ کے خاوند عبید اللہ بن جحش جب وفات پاگئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح فرمانے کا ارادہ فرمایا۔ چنانچہ سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی عدت ختم ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن امیہ فہری رضی اللہ عنہ کو اپنا وکیل بنا کر حضرت نجاشی رضی اللہ عنہا کے دربار میں بھیجا اور فرمایا:

''اگر ام حبیبہ اس پر راضی ہوں تو میرا نکاح خود میرے وکیل بن کر ان سے کردینا۔''

جب حضور شفیع عالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام حضرت نجاشی رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچا تو انہوں نے اپنی خاص ابرہ نامی کنیز کو حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے پاس حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام نکاح دینے کیلئے بھیجا اور کہا۔

اگر ام حبیبہ کو منظور ہوا تو اپنی طرف سے نکاح کیلئے کوئی وکیل مقرر کردیں۔

حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کو جب حضور نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے پیغام نکاح ملا تو آپ رضی اللہ عنہا اتنی خوش ہوئیں کہ پیغام نکاح لانے والی لونڈی ابرہ کو اپنے ہاتھوں کے دونوں کنگن، پیروں کی پازیب اور انگلیوں کے چھلے جو سب سونے کے تھے دے دیئے اور اپنے ماموں زاد حضرت خالد بن سعید بن ابی العاص رضی اللہ عنہ کو اپنا

وکیل مقرر کیا۔

جب حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی طرف سے رضامندی ہوگئی اور ان کی طرف سے نکاح کا وکیل مقرر کر دیا گیا تو حضرت نجاشی رضی اللہ عنہ نے تمام مہاجر مسلمانوں جن کے سردار حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ تھے کو اپنے دربار میں بلایا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاح کے وکیل ہونے کے سبب سے خطبہ نکاح پڑھا۔

اس کے ساتھ ہی حضرت نجاشی رضی اللہ عنہ نے چار سو دینار اپنی قوم کے سامنے رکھ دیئے۔ اس کے بعد حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے وکیل حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ نے خطبہ نکاح پڑھا۔ جب نکاح کی تقریب مکمل ہوئی، لوگوں نے اٹھنے کا ارادہ کیا تو حضرت نجاشی رضی اللہ عنہ نے ان سب کو بٹھالیا اور فرمایا:

حضرات انبیاء علیہم السلام کی یہ سنت ہے کہ نکاح کے بعد ولیمہ بھی ہوتا ہے چنانچہ سب احباب ولیمہ کی دعوت کھا کر جائیں۔ چنانچہ حضرت نجاشی رضی اللہ عنہ نے نہایت شاندار ضیافت کا اہتمام کیا۔ سب احباب دعوت ولیمہ سے فارغ ہو کر رخصت ہو گئے۔

جب سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا نکاح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوا تو اس وقت آپ رضی اللہ عنہا کی عمر 36 یا 37 سال تھی۔ یہ نکاح 6 ہجری کے آخری ایام میں ہوا۔

جب نکاح کی تمام رسومات ادا ہو چکیں تو حضرت نجاشی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ام المومنین رضی اللہ عنہا کو بحری راستے سے مدینہ طیبہ کی طرف روانہ کیا اور ساتھ بہت سی خوشبوئیں اور دیگر تحائف بھی دیئے۔

ام المومنین سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا جب مدینہ پہنچیں تو اسی دن حضور رحمت دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ خیبر سے فتح یاب ہو کر مدینہ تشریف لائے۔ ام المومنین رضی اللہ عنہا کے ساتھ آنے والوں میں حضور نبی کریم ﷺ کے چچا زاد اور آپ کے ہم شکل حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔

جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وفد کی آمد کی اطلاع ملی تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس گئے، حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی طرف بڑھے، انہیں گلے سے لگایا اور فرمایا:

تم صورت اور سیرت میں میرے مشابہ ہو میں نہیں جانتا کہ میرے لیے زیادہ خوشی کی بات کون سی ہے فتح خیبر یا آمد جعفر۔"

شاباش بیٹا! تحریم حضرت ام حبیبہ کے فضائل کے بارے میں بتاؤ؟

تحریم گویا ہوئی۔

ام المومنین سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کو "السابقون الاولون" ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔

یعنی آپ رضی اللہ عنہا ابتدائی زمانے میں ہی اسلام کے دائرہ رحمت میں شامل ہوگئیں تھیں۔

ام المومنین سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کو اسلام کے ساتھ شدید محبت تھی۔ اس کا اندازہ اس طرح سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہا نے اپنا گھر بار، والدین اور وطن فقط اسلام کی خاطر چھوڑا۔

ام المومنین سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا بہت بڑی عالم حدیث بھی تھیں۔ آپ رضی اللہ عنہا سے 65 احادیث مروی ہیں جنہیں جلیل القدر صحابہ و تابعین نے آپ سے روایت کیا۔“

شاباش! عفان! تم ہمیں حضرت ام حبیبہؓ کی مزید خصوصیات اور حسن و جمال کے بارے میں بتاؤ؟

عفان نے بولنا شروع کیا۔

”ام المومنین سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا صورت اور سیرت میں خوبصورت تھیں اور آپ کے والد حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ آپ کے حسن پر فخر کیا کرتے تھے۔

”حسن“ ظاہری رنگ و صورت، نین نقش اور خدوخال کے متوازن ہونے کا نام ہے اور ”جمال“ سیرت و کردار، گفتار و افعال، عقل و فہم کی زیادتی کا نام ہے۔ یہ دونوں وصف حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا میں موجود تھے۔ اس لیے آپ حسین بھی تھیں اور جمیل بھی۔

یہ بھی حضرت سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کی فضیلت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن ان کے والدین کے گھر کو دارالامن قرار دے دیا جبکہ ابھی تک ان کے والدین ایمان نہیں لائے تھے۔“

عمر! تم ہمیں حضرت سیدہ ام حبیبہ کے علم و فضل کے بارے میں بتاؤ؟

عمر نے جواب دینا شروع کیا۔

”دیگر ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی طرح ام المومنین سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا بھی علم و فضل کا خزینہ تھیں۔ آپ رضی اللہ عنہا چونکہ شارح اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ تھیں اس لیے آپ رضی اللہ عنہا نے بہت قریب سے مصطفی کریم علیہ السلام کے قول و فعل کا مشاہدہ کیا، اسے یاد رکھا اور پھر امت مسلمہ تک پہنچایا۔

ام المومنین سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا بڑے پختہ ایمان والی تھیں۔ آپ رضی اللہ عنہا نے اس وقت اسلام قبول کیا جب گنتی کے ہی چند افراد ہی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے تھے۔

احمد! یہ بتاؤ آپ رضی اللہ عنہا کی کوئی اولاد بھی ہوئی؟

احمد نے جواب دیا۔

”ام المومنین سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کے ہاں آپ کے پہلے شوہر عبید اللہ بن جحش سے ایک لڑکا اور ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ لڑکے کا نام عبداللہ تھا اور لڑکی کا نام حبیبہ تھا۔

حضرت حبیبہ رضی اللہ عنہا نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آغوش میں پرورش و تربیت پائی اور قبیلہ مخلف کے رئیس کے بیٹے عروہ بن مسعود ثقفی کے ساتھ منسوب ہوئیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ رضی اللہ عنہا کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔"

عبدالمجید!!! یہ بتاؤ، حضرت ام حبیبہ کا انتقال کب ہوا؟

عبدالمجید نے جواب دیا۔"ام المومنین سیدہ ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے 73 سال کی عمر میں اپنے بھائی کاتب وحی حضرت امیر معاویہ بن سفیان رضی اللہ عنہا کے دور خلافت میں 44 ہجری کو مدینہ میں انتقال فرمایا اور جنت البقیع میں تدفین ہوئی۔

مغرب کی اذان ہونے لگی تھی۔ اذان کے بعد سب نماز کی تیاری کرنے لگے اور یوں یہ محفل برخواست ہوگئی۔

☆۔۔۔۔☆۔۔۔۔☆

ضروری اعلان

اطلاع کی جاتی ہے کہ مسلمان بچے خریدنے کے لیے آنلائن پیمنٹ کا طریقۂ کار فی الحال عارضی طور پر بند کردیا گیا ہے۔ برائے مہربانی اشتہار میں دیئے گئے نمبر پر ہرگز پیسے نہ بھیجیں۔

انشاءاللہ مسلمان بچے کی آنلائن ترسیل کا نظم بہت جلد بہتر کر کے اطلاع کردی جائے گی۔

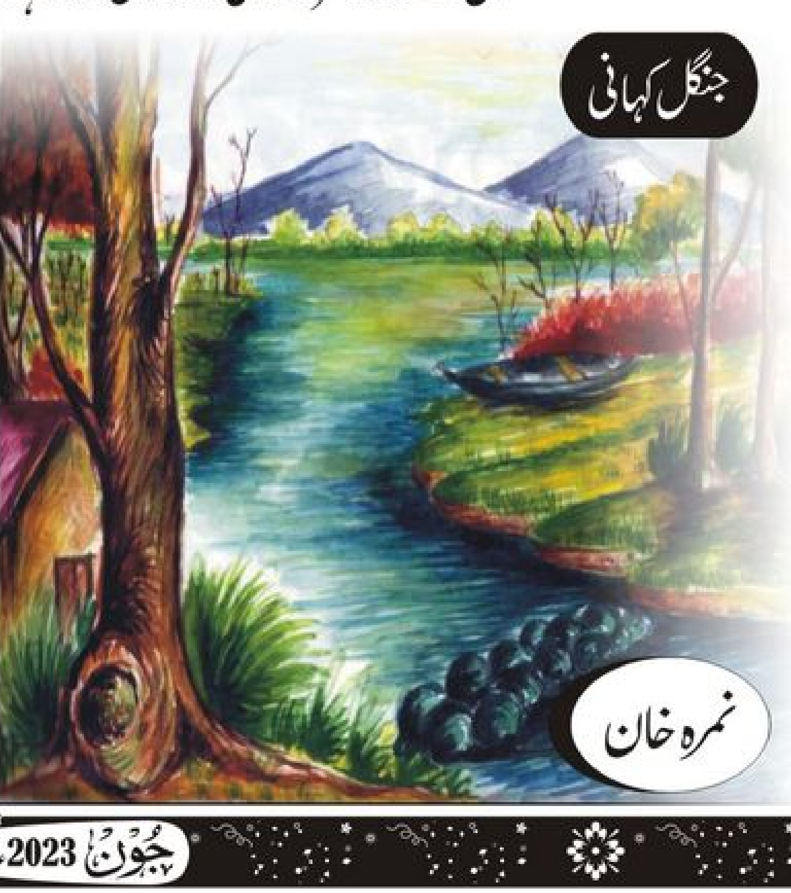
بشکریہ ادارہ

حسد کا برا انجام



جنگل کہانی

نمرہ خان



جنگل میں ہر طرف بندر میاں کی دعوت کی دھوم مچی ہوئی تھی۔ یہاں تک کے گھر گھر جا کر دعوت نامہ بھیجا گیا تھا۔شام کو دعوت تھی۔ گلہری نے درخت کی ٹہنیوں سے لٹکتے ہوئے بی لومڑی سے پوچھا جو درخت کے نیچے سے گزر رہی تھیں۔

"بندر کی دعوت پر کیا پہن کر جاؤ گی؟ بی لومڑی! تیاری کرلی؟؟"

"مجھ سے تو فیصلہ ہی نہیں ہو رہا۔" وہ آخر میں اداس سی ہوگئی۔

"میرا جانے کو تو بہت دل کر رہا ہے لیکن صبح سے طبعیت کچھ ٹھیک نہیں۔ بخار سے جسم چور ہو رہا ہے۔ ابھی بھالو حکیم سے دوائی لائی ہوں۔ دوائی لیکر تھوڑی دیر آرام کروں گی۔" لومڑی کے مضمحل انداز سے وہ گلہری کو کافی حد تک بیمار بھی لگی تھی۔

یہ کہتے ہی وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی چل دی۔ گلہری نے اسکو جاتا دیکھا تو خود بھی اپنے گھر میں چلی گئی جو درخت میں ہی تھا۔

☆----☆----☆

ادھر بندر میاں بھی اپنے والدین کے ساتھ بازار آئے ہوئے تھے جو سوٹ انکی والدہ پسند کرتیں تو وہ کہتے "بھلا اس طرح کا لباس میں اپنی دعوت پر پہنوں گا؟"

ان کے تو ناز نخرے ہی وارہ نہیں کھا رہے

تھے۔والدین کو عجیب پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔
ان کی والدہ جھنجھلا کر بولیں۔

''اب پسند کر بھی لو!ہم نے گھر جا کر اور انتظامات بھی دیکھنے ہیں''

لیکن ان کا ایک ہی انداز تھا ہر لباس کو اپنے ساتھ لگا کر دیکھتے پھر منہ چڑا کر کہتے''یہ کچھ خاص نہیں''۔وہ منہ چڑا کر کہنے والا انداز ہی نرالا تھا۔

☆---☆---☆

ادھر بندر میاں کو لباس پسند نہیں آ رہا تھا ادھر شیر میاں کے بچے شیرو ناراض ہوئے بیٹھے تھے''کہ بندر کے والدین بندر سے کتنا پیار کرتے ہیں۔اس کی دعوت منا رہے ہیں اور آپ جنگل کے بادشاہ ہو کر میری دعوت نہیں مناتے۔مجھے کوئی بات نہیں کرنی آپ سے۔''

وہ بندر کی دعوت کا سن کر ناخوش تھے اور تب سے خفا خفا سے منہ بسورے بیٹھے تھے۔آخر کار شیر میاں نے انہیں سمجھایا کہ دوسروں کی خوشی میں خوش ہونا چاہیے،نہ کہ حسد کرنا چاہیے۔ان کی نصیحت نے اثر کیا تھا یا نہیں البتہ وہ جانے کے لیے مان ضرور گئے تھے اور کب سے کمرے میں تیار ہو رہے تھے۔

☆---☆---☆

شام ہوتے ہی سب جانور ان کے گھر پہنچ چکے تھے گھر کو رنگ برنگی برقی قمقموں سے سجایا گیا تھا۔بندر میاں نے اپنی پسند کا خوب صورت لباس پہننے کے ساتھ ساتھ سر پر تاج بھی پہنا ہوا تھا۔جس سے وہ کافی خوبصورت نظر آ رہے تھے۔

شیرو میاں یہ دیکھ کر جل اٹھے کہ''یہ بندر ہماری جگہ لے گا''وہ جو بڑی مشکلوں سے شیر اور شیرنی کے منانے پر تیار ہوئے تھے لیکن یہاں آ کر وہ مزید جھلس گئے تھے۔ساری نصیحتیں بے سود گئی تھیں۔پورے جنگل میں دھوم مچی ہوئی تھی۔لومڑی کہاں بیمار تھی۔ان سے بھی رہا نہ گیا تھا اور بن سنور کر پہنچ گئیں۔

شیرو میاں جو دل ہی دل میں جل رہے تھے۔آخر اپنی جگہ سے اٹھے۔شیر نے انہیں جاتے دیکھا تھا جس پر انہوں نے نظر انداز کیا۔کچھ ہی دیر میں بندر میاں نے کیک کاٹا۔سب نے تحائف دیے تو ان کا چہرہ کھلکھلا اٹھا۔

☆---☆---☆

کچھ ہی دیر بعد انواع و اقسام کے کھانوں کی خوشبو ہر طرف پھیل گئی۔یہ دیگیں خصوصی طور پر جنگل کے مشہور پکوان ریچھ سے پکوائی گئی تھیں۔لومڑی بی کہاں بیمار تھیں۔لیکن کھانا شروع کیا تو پھر کھاتی ہی چلی گئیں اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ''طبعیت کچھ ٹھیک نہیں۔مجھ سے تو کھایا ہی نہیں جا رہا۔''ہرن کو تو اب انکا یہ جملہ ازبر ہو چکا تھا۔

☆---☆---☆

کھانے کی فراغت کے بعد سب جانور گھر لوٹے ہی تھے کہ بیمار سے ہو گئے۔الٹیاں پیٹ

خراب سب کی ایک ہی حالت تھی۔صبح تک سب کی حالت نڈھال سی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے حکیم بھالو کے دواخانے کے آگے ایک لمبی لائن لگ چکی تھی۔ویسے تو حکیم بھالو بھی دعوت پر مدعو تھے لیکن ان کو دوائیاں لینے کے لیے شہر جانا تھا اس لیے وہ نہیں آپائے تھے۔

حکیم بھالو کے بتانے کی دیر تھی کہ" کھانے میں کسی نے زہریلی چیز ملائی ہے جس کی وجہ سے ہی وہ بیمار ہوئے ہیں۔"بس پھر یہ بات جنگل میں آگ کی طرح پھیل گئی۔

☆---☆---☆

بندر میاں اور ان کے والدین اپنے گھر کے باہر جانوروں کا جمِ غفیر دیکھ کر حیران تھے۔تبھی لومڑی بی اپنے مخصوص انداز میں بولیں۔

"تم لوگوں کا بندر کی دعوت کرنا صرف ایک بہانہ تھا،اس کے پیچھے ضرور تمہاری کوئی سازش تھی"

بادشاہ شیر تو خود بیمار ہوگئے تھے انہیں بھی بندر کے والدین کی ہی کوئی سازش لگ رہی تھی۔

"مجھے تو لگتا ہے یہ جنگل پر حکمرانی کرنا چاہتے تھے،ابا جان!

دیکھا نہیں تھا آپ نے بندر نے کیسے سر پر تاج پہنا ہوا تھا؟ تو مقصد صاف ہے کہ یہ بادشاہ بننا چاہتا تھا اور یہ ہم سب کو مارنا چاہتے تھے۔"

بندر اور اس کے والدین اپنے اوپر لگے الزام دیکھ اور سن رہے تھے۔ان کے تو علم میں ہی نہیں تھا کہ یہ سب ہوجائے گا۔بندر کے والد نے بولنا چاہا لیکن شیر نے غصے سے دھاڑتے ہوئے ان تینوں کو ایک ماہ کے لیے جنگل سے نکل جانے کو کہا۔

"وہاں کا اصول تھا جو کوئی جرم کرتا تو سزا کے طور پر اسے جنگل سے ایک ماہ کے لیے نکال دیا جاتا"بندر میاں کو غصہ آیا کہ انہیں اپنے حق میں بولنے کا موقع تک نہ دیا تو اب وہ بھی یہاں نہیں رہیں گے۔بندر کے والدین تو دلبرداشتہ سے ہوگئے کیونکہ ان کی تو نیت بالکل صاف تھی۔لیکن کسی نے ان کی کوئی بات نہ سنی۔

☆---☆---☆

سارے جنگل والے تو ان کی شرافت کی تعریفیں کرتے تھے۔اب سارے ان کے دشمن ہوگئے تھے۔

بندر کے والدین سوچ سوچ کر آبدیدہ ہو رہے تھے،جب وہ جنگل چھوڑ کر دوسرے جنگل کی جانب جارہے تھے۔ابھی راستے میں ہی تھے کہ انہوں نے قریب سے شیرو کی آواز سنی۔وہ اپنے والدین کو مدد کے لیے پکار رہا تھا۔

انہوں نے پریشانی کے عالم میں اس کی آواز کا پیچھا کیا تو دیکھا چیتا شیرو پر حملہ کر رہا تھا۔شیرو کو وہ زخمی کر چکا تھا۔

بندر اور اس کے والدین نے درخت کے

اوپر چڑھ کر سارا منظر دیکھ لیا تھا تو انہوں نے فوراً ہی شیرو کی مدد کرنے کی ٹھانی۔ انہوں نے زمین سے پتھر اٹھائے اور چیتے کو مارے۔ جس سے چیتا ڈر کر بھاگ گیا۔ شیرو زخموں سے چور ادھ کھلی آنکھوں سے بندر اور اس کے والدین کو دیکھ رہا تھا۔ جو اسے گود میں اٹھا کر جنگل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پھر زخموں سے تاب نہ لاتے ہوئے وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔

بھالو حکیم نے جلدی جلدی اس کے زخموں پر مرہم لگا کر پٹی کی۔ شیرو کو ابھی تک ہوش نہیں آیا تھا۔ شیر اور شیرنی تو اپنے بچے کی حالت دیکھ کر رو پڑے۔

☆۔۔۔☆۔۔۔☆

کچھ دیر بعد جیسے ہی شیرو کو ہوش آیا تو اس کی نظروں میں سارا منظر گردش کرنے لگا تو ندامت سے آنسو نکل آئے پھر کراہتے ہوئے وہ بولا۔

''بندر اور اس کے والدین نے کھانے میں کچھ نہیں ملایا تھا۔''

''تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟'' شیر نے شکی نظروں سے دیکھا، وہ سر جھکائے خاموش ہو چکا تھا اور اگلے ہی لمحے شیر کو سمجھنے میں دیر نہ لگی۔

شیر اور شیرنی سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

''مجھے معاف کر دیں۔ میں اپنی غلطی پر شرمندہ ہوں۔'' وہ بھیگی آواز میں بولا۔

☆۔۔۔☆۔۔۔☆

اگلے دن شیر اور شیرنی نے سب جانوروں کو جمع کیا اور ساری بات بتا دی جس پر سب جانور آگ بگولہ ہو گئے۔ باقی جانوروں کا تو پتہ نہیں لیکن لومڑی کسی بھی طرح معاف کرنے کے حق میں نہیں تھی اور انہیں لگ بھی رہا تھا کہ کہیں بادشاہ شیر اپنی اولاد کو سزا دینے کی بجائے معاف ہی نہ کر دیں۔

جو بھی تھا ان کے زخم ہرے ہو گئے تھے وہ بھی تو جرم کرنے کے بعد معافی مانگ چکی تھیں پھر بھی انہیں ایک مہینے کے لیے دوسرے جنگل میں جا کر رہنا پڑا تھا وہ بول پڑیں۔

''عام عوام جرم کرے تو اصول کے مطابق جنگل سے نکال دیا جائے اور بادشاہ کا بیٹا جرم کرے تب بھی اصول یہی ہونا چاہیے۔ ورنہ یہ تو ناانصافی ہو گی۔ مجھے تو لگتا ہے سزا ملنی چاہیے۔''

لومڑی کی بات میں کافی دوسرے جانور بھی متفق نظر آئے۔

☆۔۔۔☆۔۔۔☆

بادشاہ شیر نے تو اب تک کوئی فیصلہ نہیں سنایا تھا۔ البتہ شیرو کو لومڑی کی بات پر رونا آیا۔ بندر اور اس کے والدین تو خاموشی سے سب سن رہے تھے۔ البتہ سب جانوروں کی ایک ہی رائے تھی کہ شیرو کو بھی ایک ماہ کے لیے جنگل سے نکال دیا جائے۔ بس شیر کے فیصلے کی دیر ہی تھی۔

☆۔۔۔☆۔۔۔☆

شیرو کو ایک مہینے کے لیے دوسرے جنگل میں رہنا پڑے گا تا کہ آئیندہ کسی کو نقصان پہنچانے سے پہلے سو بار سوچے۔'' آخر کار شیر کی گرج دار آواز فضا میں گونجی تو لومڑی کے چہرے پر والہانہ مسکراہٹ چھائی۔ شیرو سر جھکائے نادم سا کھڑا فیصلے کو سن رہا تھا۔

''پر ایک شرط پر۔۔۔'' بندر میاں آخر بول ہی پڑے۔ وہ حتمی فیصلے پر ناخوش دکھائی دیے۔

''شیرو میاں کے ساتھ میں بھی جاؤں گا۔''

''وہ کیوں؟؟؟'' سب یک زبان پوچھنے لگے۔ تا کہ ''انہیں پھر چیتا نقصان نہ پہنچا سکے۔'' بادشاہ شیر نے حیرت سے بندر کو دیکھا پھر ایک کاٹ دار نظر شیرو پر ڈالی جس پر ان کی نظریں مزید شرم سے جھک گئیں۔

دوسرے جانوروں کا تو بندر کی اس بات پر دل پسیج گیا۔ جو بھی تھا کوئی بھی بندر میاں کو دوسرے جنگل نہیں بھیجنا چاہتا تھا لیکن وہ بھی بضد تھے۔ لیکن بادشاہ شیر کسی بھی طور پر سزا کم کرنے کے حق میں نہیں تھے۔

کیونکہ اپنے بیٹے کی حرکت پر وہ خود بھی شدید شرمندہ تھے کیونکہ شیرو کے حسد کی وجہ سے بندر میاں اور اس کے گھر والوں کو جو بے عزتی برداشت کرنی پڑی وہ ان کو رہ رہ کر بے سکون کر رہی تھی آخر انہوں نے یہ فیصلہ دوسرے جانوروں پر چھوڑ دیا کیونکہ شیرو کی وجہ سے تکلیف ان سب جانوروں نے برداشت کی تھی۔ شیرو سب کو التجائی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

☆۔۔۔☆۔۔۔☆

''کیوں نہ ہم یہ قانون بنائیں کہ اگر کوئی غلطی کرتا ہے تو اسے اس کے گھر سے دربدر کر دیا جائے۔ کہنے کا مقصد یہ کہ اگر کوئی ایسی ویسی غلطی کرتا ہے تو اسے نقصان پہنچانے والے کے گھر شرافت سے رہنا پڑے گا۔ ان کا کام میں ہاتھ بٹانا پڑے گا۔''

سب جانوروں کی مشترکہ رائے کے بعد لومڑی بی نے یہ فیصلہ کیا۔ کیونکہ اب وہ سب اتنے بھی بے رحم نہیں تھے۔ یہ تجویز سب کو پسند آئی اور بادشاہ شیر نے حامی بھرتے کہا کہ آئندہ ایسا ہی کیا جائے گا۔ جس پر سب کے چہرے کھل اٹھے۔ شیرو میاں نے بھی آئندہ حسد کرنے سے توبہ کر لی تھی۔ کیونکہ وہ سمجھ چکا تھا حسد کا انجام برا ہوتا ہے۔

''اور اب ہم بھی بندر کی کل پورے جنگل میں دعوت منائیں گے۔'' شیر نے بندر اور اس کے والدین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

یہ سننا تھا کہ سب جانور خوشی کے مارے جھوم اٹھے۔

☆۔۔۔☆۔۔۔☆

محب وطن

ذوالفقار علی بخاری

’’بھولے !ذرا تیز آواز میں ٹیپ ریکارڈر سے شور شرابا کرو! تاکہ پورے محلے میں یہ خوف پھیل جائے کہ یہاں واقعی بھوت رہتے ہیں۔‘‘

مرید نے بھولے کو حکم دیا۔

بھولے کا اصل نام تو بلاول تھا مگر سب پیار سے اُسے بھولا ہی کہتے تھے کہ وہ شکل صورت سے معصوم نظر آتا تھا۔اُس کی شکل سے ہی اکثر افراد دھوکا کھا جاتے تھے مگر وہ جرائم کی دنیا میں بڑا مشہور تھا۔اس نے کئی بچوں کو اغوا کر کے تاوان وصول کیا تھا۔

ان جرائم میں مرید کا ساتھ بھی شامل تھا۔

پولیس کے ہاتھ ابھی تک وہ نہیں آسکے تھے کہ وہ کوئی ثبوت اپنے خلاف نہیں چھوڑتے تھے۔

نیلے بنگلے کو احمد حسن صاحب کے جانے کے بعد بھوت بنگلہ قرار دے کر انھوں نے اپنے لیے محفوظ ٹھکانہ بنالیا کہ یہاں پر کوئی بھی نہیں آتا تھا۔وہ جہاں بھی جاتے تھے۔وہ نت نئے طریقوں سے لوگوں کے ساتھ گھل مل کر اور خوف ناک ماحول بنا



کروار داتیں کرتے تھے۔

گزشتہ تین ماہ سے وہ شاہ زیب کے محلے میں آ کر رہنے لگے تھے۔اسی عرصے میں تین بچے اغوا ہو چکے تھے۔

اُن کے والدین کو بھاری رقم کی ادائیگی کے بعد اُن کی شکل پھر سے دیکھنے کو ملی تھی۔ پولیس چالاک مجرموں پر ہاتھ نہیں ڈال سکی تھی کہ اُن کی شناخت ممکن نہ ہو سکی تھی۔

☆۔۔۔☆۔۔۔☆

شاہ زیب اپنے دوستوں اقرار اور عبدالرحمن سے کافی دنوں سے سن رہا تھا کہ پڑوس میں احمد حسن صاحب کا نیلے رنگ والا بنگلہ اب بھوت بنگلہ بن چکا ہے۔ اکثر وہاں سے چیخ و پکار کی عجیب و غریب آوازیں سنائی دیتی ہیں۔

اقرار کم زور دل کا لڑکا تھا اس لیے اُس نے وہاں جا کر تحقیقات کرنے سے منع کر دیا اور عبدالرحمن نے بھی انکار کر دیا۔دونوں کو بھوت پریت سے بہت ڈر لگتا تھا۔

شاہ زیب اپنے والدین سے جنات کے حوالے سے سنتا رہتا تھا۔وہ آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا اور والدین کے اعتماد دلوانے کی وجہ سے وہ اس قدر بہادر ہو چکا تھا کہ تنہا سچائی کا پتا چلا سکے۔

اُس کے والدین نے ہمیشہ سچ بولنے کا درس دیا تھا اور جھوٹ سے نفرت کی تعلیم دی تھی۔

اُسے اپنی مرضی سے سب کچھ کرنے کا کہا گیا تھا مگر کہیں کہیں اُسے مشورے کے ساتھ اپنی سوچ بدلنے پر بھی مائل کیا جاتا تھا۔اس کے اندر حب الوطنی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اس لیے اس نے دل میں ارادہ بنالیا کہ وہ نیلے بنگلے کا راز جان کر رہے گا کہ وہاں کچھ غلط کیوں ہو رہا ہے۔

☆۔۔۔☆۔۔۔☆

اتوار کے دن شاہ زیب صبح اُٹھا تو معلوم ہوا کہ گھر میں دہی اور دودھ نہیں ہے۔شاہ زیب کو امی نے بازار سے اشیاء لانے کے لئے کہا تو وہ فوراً تیار ہو گیا۔

ابھی وہ چچا اللہ رکھا کی دکان کے پاس پہنچا ہی تھا اُسے دو آدمی آپس میں بات کرتے ہوئے سنائی دیئے۔وہ چونکہ چچا اللہ رکھا کی دکان کے باہر چائے پی رہے تھے اسی وجہ سے اُسے حیران کن جملے سننے کو ملے۔

”بھولے! ہم نے تین بچوں کو اغوا کر کے دبئی بھیجوانا ہے۔ ہر ماہ ایک ایک بچے کے اغوا سے کام نہیں چلے گا۔وہاں جلد ہی اونٹوں کی ریس لگنے والی ہے۔“

کرخت چہرے والے شخص نے کہا جس کا نام مرید تھا۔

”مرید! آہستہ بولو! ہم جہاں ہیں وہاں دیواروں کے بھی کان ہیں۔“

بھولے نے مرید کو ٹوکا۔

مرید نے سرگوشی میں بھولے سے باتیں کرنا شروع کر دیں۔

شاہ زیب نے دونوں کے چہروں کو اچھی طرح سے دیکھا تاکہ بعد میں وہ ان کی شناخت کر سکے۔ اُسے خبر ہو چکی تھی کہ اُس کے محلے میں ہونے والی وارداتوں میں کون ملوث ہے۔ شاہ زیب نے واپس آ کر اپنے والد صاحب کو سنی ہوئی بات بتائی تو انھوں نے ایک منصوبہ بنالیا۔

☆۔۔۔☆۔۔۔☆

شاہ زیب کی گمشدگی نے محلے میں خوف و ہراس پیدا کر دیا تھا۔ سب لوگ ڈر چکے تھے۔

اب وہ اپنے بچوں کو کھیلنے کے لئے محلے کے قریبی پارک تک جانے سے روک رہے تھے۔

شاہ زیب نے غضب کی اداکاری کی تھی اُس نے خود کو عین بھوت بنگلہ کوٹھی کے سامنے بے ہوش ہونے کی اداکاری کرتے ہوئے گرایا تھا اُس نے دیکھ لیا تھا کہ بھولا کسی کام سے گھر واپس آ رہا ہے۔ اُس نے موقع غنیمت جانتے ہوئے شاہ زیب کو اُٹھایا اور اندر لے آیا۔

دوپہر کے وقت کوئی بھی اُسے دیکھنے والا گلی میں موجود نہیں تھا۔ دوسری طرف مرید اور بھولے کو یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ شاہ زیب اغوا ہوا نہیں تھا اُس نے خود کو اغوا کروایا ہے۔

شاہ زیب کے دوست اقرار اور عبدالرحمن بھی اگلے دو روز میں اُس کے پاس آ چکے تھے۔

تیسرے دن ان کی ننھی بہن تعبیر بھی ان کے ساتھ شامل ہو گئی تھی۔ اغوا کاروں نے حکمت عملی بنائی ہوئی تھی کہ جب بھی وہ بچوں کو اغوا کر کے لاتے تھے تب ہی بھوت پریت کی آوازوں کا ڈرامہ کرتے تھے تاکہ کوئی بھی بچوں کی چیخ و پکار سن کر وہاں تک مدد کے لئے نہ آسکے۔ چار دن بعد مرید اور بھولے نے چاروں بچوں کو ایک ساتھ ایئر پورٹ لے جانا تھا تاکہ انھیں باہر بھیجا جا سکے۔

سب تیاریاں مکمل ہو چکی تھی مگر عین نماز فجر کے وقت جب وہ سوئے ہوئے تھے۔ پولیس کا چھاپہ پڑا اور بھولے اور مرید کو گرفتار کر لیا گیا۔

یہ پہلے سے طے شدہ منصوبہ تھا کہ کس وقت کارروائی کرنی ہے۔

شاہ زیب کے والد نے پولیس کو اطلاع دی تھی۔

شاہ زیب نے وائس ریکارڈر آلہ اپنے پاس رکھا ہوا تھا جس سے بھولے اور مرید کی آپس میں کی جانے والی تمام گفتگو ریکارڈ ہو چکی تھی۔ یہ ثابت ہو چکا تھا کہ انھوں نے اس سے قبل ملک بھر میں کئی اغوا کی وارداتیں کی ہوئی ہیں۔

پولیس نے شاہ زیب اور اُس کے والد کو تعریفی اسناد سے نوازا تھا۔ ملکی اخبارات میں خوب چرچا ہوا تھا کہ کیسے دو حقیقی محب وطنوں نے بردہ فروشوں کو پکڑوانے میں مدد کی ہے۔

☆۔۔۔☆۔۔۔☆



ایمان داری

انعم رؤف

شاہ زر دسویں جماعت کا ہونہار طالب علم تھا۔ مگر آج پڑھائی میں دل نہیں لگ رہا تھا اور اپنی کلاس میں اداس اور پرملال بیٹھا تھا۔ اس کے ذہن میں یہی خیال آرہے تھے۔

آج بھی سیٹھ نے فیکٹری نہیں آنا تھا نہ ہی اسے مزدوری ملنی تھی۔ گھر کے حالات پہلے ہی خراب تھے اور دن بہ دن خراب ہی ہوتے جا رہے تھے۔

بیمار باپ (جو ایکسیڈنٹ کے بعد معذور بھی ہو چکا تھا) تین چھوٹے بہن بھائی بھی تھے۔ مہنگائی کے اس دور میں ایک دو وقت کھانا ہی بہت مشکل ہو رہا تھا۔ اوپر سے بیمار باپ کی دوا دارو کے لیے رقم کہاں سے آتی؟

ماں نے گھر میں ہی چھوٹی سی سودا سلف کی دوکان کھول رکھی تھی جس سے بمشکل دو وقت کھانا پورا ہوتا تھا سو اس نے بھی والدہ کا ہاتھ بٹانے کا سوچا اور سیٹھ کی فیکٹری میں مزدوری کرنے لگا۔ مگر گزشتہ کئی روز سے سیٹھ بیرون ملک دورے پر گیا تھا جس کی وجہ سے شاہ زر کو مزدوری نہیں ملی تھی اور حالات مشکل سے مشکل ہو رہے تھے۔

☆۔۔۔☆۔۔۔☆

"بیٹا ابو کی دوا لے کر نہیں آئے؟" شام کو گھر میں داخل ہوتے ہی اس کی امی نے پوچھا۔

"آج پھر سیٹھ فیکٹری نہیں آیا۔ کیسے لاتا دوا؟" مایوسی اور رنجیدگی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

"تمہارے چچا جان سے کچھ پیسے مانگ لیتے ہیں۔ آخر جیسے بھی ہیں تمہارے ابو کے بھائی ہیں۔"

"امی! اگر چچا جان کو ہمارا خیال ہوتا تو وہ قطع تعلق ہی کیوں کرتے؟" اس نے گہرے دکھ سے جواب دیا۔



”بیٹا! صرف دوا کے پیسے تو مانگ سکتے ہیں اور پھر جیسے ہی پیسے آجائیں گے ہم لوٹا دیں گے تمہارے ابو کی دوا کا ناغہ ہوجاتا ہے۔ پھر ان کا مرض کتنا بڑھ جاتا ہے۔ یہ تم جانتے ہی ہو۔“ اسے خود ابو کی فکر کھائے جارہی تھی۔

”کل کسی اور سے ادھار کی بات کرتا ہوں۔ آپ بس دعا کریں سیٹھ جلد فیکٹری کا چکر لگالے۔ اللہ بہت بڑا ہے کوئی سبب بنادے گا۔“ اس نے نرمی سے کہتے ہوئے بات ختم کی۔

☆۔۔۔☆۔۔۔☆

ظفر شاہ اور عبدالوہاب شاہ دو جڑواں بھائی تھے۔ دونوں ہی اپنا ذاتی کاروبار کرتے تھے۔ ظفر شاہ کی فطرت میں شروع سے ہی عیاری تھی۔ مال کو زیادہ قیمت پر فروخت کرنا، گھٹیا مال کو جھوٹ بول کر خوب تعریفیں کرکے بیچنا اس کی عادت تھی۔

عبدالوہاب شاہ ہمیشہ مناسب قیمت پر مال بیچتا اور ایمان داری سے کام کرتا۔ دھوکا بازی اور چالاک فطرت کی بنا پر ظفر شاہ، عبدالوہاب شاہ سے زیادہ پیسے کما لیتا تھا۔

ظفر شاہ کا لالچ دن بہ دن بڑھتا ہی جارہا تھا۔ ایک اچھا خاصا کشادہ گھر تھا مگر لڑ جھگڑ کر ظفر شاہ نے اس کے بھی دو حصے کروادیے تھے اور اچھا پورشن قبضے میں کرلیا یہاں بھی عبدالوہاب شاہ نے صبر کیا کیونکہ وہ لڑائی نہیں کرنا چاہتا تھا۔

عبدالوہاب شاہ کی زندگی یونہی صبر و شکر سے بسر ہو رہی تھی۔ خدا کی کرنی ایک روز سڑک پار کرتے ہوئے ایک تیز رفتار ٹرک نے عبدالوہاب شاہ کو ٹکر ماری جس سے اس کی جان تو بچ گئی مگر زندگی بھر کے لیے معذور ہوگیا اور بستر کا ہو کر رہ گیا۔

سارا سرمایہ اس کے علاج پر خرچ ہوگیا۔ بچے بہت چھوٹے تھے کمائی کے قابل نہ تھے۔ ان حالات میں اس کی نیک سیرت بیوی نے اس کو حوصلہ دیا اور گھر میں سودے سلف کی دوکان کھول کر زندگی کی گاڑی چلانے لگی۔

وہ ایک نیک دل عورت تھی۔ اس نے اپنے شوہر اور بچوں کو ہمیشہ تسلی دی کہ ”اللہ بہت بڑا ہے وہ ضرور ہمارے حالات بدلے گا“

☆۔۔۔☆۔۔۔☆

”اس طرح محنت مزدوری کرنے میں کچھ نہیں رکھا۔ میں تجھے سکھاتا ہوں کیسے کم وقت میں زیادہ پیسے کمائے جاتے ہیں۔“ تو بس میرے ساتھ کام شروع کر۔ (آج امی کے بار بار کہنے پر شاہ زر چچا جان سے ادھار رقم لینے آیا تھا۔) ظفر شاہ نے شاہ زر کو یوں پریشان دیکھا تو گویا ہوا۔

عبدالوہاب شاہ کی ایمان داری کی وجہ سے ہر ایک اس کی تعریف کرتا تھا اور یہ ہی بات ظفر شاہ کو حسد میں مبتلا کرتی تھی۔ وہ کوشش کرتا رہتا تھا کہ کسی طرح وہ بھی بے ایمانی کی راہ پر چل پڑے۔ مگر وہ ہمیشہ ہی اسے خاموش کروادیا کرتا۔

چنانچہ اب اس نے شاہ زر کو اس راہ پر

چلانے کی کوشش کی مگر تیرہ سال کے بچے کی بات سن کر حیران رہ گیا۔

"چچا جان! میں اپنے گھر والوں کو حرام کا لقمہ نہیں کھلانا چاہتا، نہ کبھی ہمارے والد نے ہمیں کھلایا ہے۔ مجھے اللہ سے ڈر لگتا ہے۔ کوئی نہ بھی دیکھے لیکن وہ تو ہمیں دیکھ رہا ہے۔

"بس تو بھی اپنے باپ کی طرح ان ہی باتوں میں لگا رہ! اتنی مہنگائی کا دور ہے۔ ساری زندگی باپ کی طرح کنویں کا مینڈک بنا رہنا تو ساری زندگی ایسے ہی خوار ہوتا رہے گا" غصے میں اسے برا بھلا کہتا وہ وہاں سے چلا گیا۔

"اللہ بہت بڑا ہے۔ بے شک وہی مشکل حالات سے نکالے گا" چچا کو جاتا دیکھ کر اس نے ہلکی آواز میں نم آنکھوں کے ساتھ کہا۔

وہ بے بسی اور بے چینی سے اٹھا اور گھر جانے لگا آنسو اب اس کی آنکھوں سے شدت سے بہہ رہے تھے۔ وہ مایوسی سے گھر کے راستے پر چل رہا تھا کہ ایک دم اسے محسوس ہوا۔ جیسے اسے کسی نے آواز دی ہو۔

اس نے بے دلی سے مڑ کر دیکھا تو حافظ صاحب کھڑے تھے جن کے شہر میں کئی چلتے پھرتے سٹور تھے۔

"ارے بیٹا! میں کب سے آواز لگا رہا ہوں مگر تم اپنے ہی خیالوں میں چلے جا رہے تھے۔ اصل میں تم سے ایک ضروری کام تھا" حافظ صاحب گویا ہوئے۔

"جی! جی! انکل! فرمائیے!"

"بیٹا! اصل میں مجھے شام کے وقت اپنے بحریہ ٹاؤن والے سٹور پر ایک ہیلپر لڑکے کی ضرورت ہے جو اچھے سے کام سنبھال سکتا ہو اور حساب کتاب بھی جانتا ہو۔ مجھے کسی نے تمھارے بارے میں بتایا ہے۔

کام بھی زیادہ نہیں ہے تم آرام سے ساتھ ہی اپنی پڑھائی بھی کر سکتے ہو۔ سٹور تمہارے گھر سے قریب بھی ہے اور تنخواہ بیس ہزار ہے بس ایمانداری شرط ہے۔" حافظ صاحب گویا ہوئے۔

شاہ زر حیرت اور تشکر کی ملی جلی کیفیت میں گھرا ٹکر ٹکر حافظ صاحب کا چہرہ دیکھ رہا تھا بیس ہزار تو وہ فیکٹری میں دو ماہ لگاتار کام کر کے بھی نہیں کما سکتا تھا۔

"جی! جی! انکل! ان شاء اللہ میں کل سے حاضر ہو جاؤں گا۔" بمشکل وہ بول پایا۔

حافظ صاحب مسکرا کر چل پڑے۔

اس نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بے ساختہ نم آنکھوں سے خدا کا شکر ادا کیا۔

گھر پہنچتے ہی اس نے سب کو خوشخبری سنائی۔ بے ساختہ سب کی زبان پر یہی الفاظ جاری ہوئے۔

"اللہ بہت بڑا ہے۔ بے شک وہی حالات بدلنے پر قادر ہے"

عبد الوہاب شاہ کی ایمان داری اور اللہ پہ یقین نے آج ان کے حالات بدل دیے تھے۔

بے شک اللہ سب سے بڑا اور وہی حالات بدلنے پر قادر ہے ہمیں بس اس پہ یقین ہونا چاہیے۔

☆...☆...☆

محمد مقصود احمد شہیدؒ

غازی علم الدین شہید رحمۃ اللہ علیہ سے غازی عامر چیمہ شہید رحمۃ اللہ علیہ تک



قسط 11

(گزشتہ سے پیوستہ)

اگست کا مہینہ تھا۔ شدید گرمی تھی۔ ڈاکٹر کی رہائش ہسپتال سے ملی ہوئی تھی۔ صحن میں قدم رکھا تو سامنے درختوں کے گھنے سائے میں ملعون سو رہا تھا، جس نے کروڑوں مسلمانوں کی نیندیں حرام کر رکھی تھیں۔ قریب ہی دوسری چارپائی پر اس کی بیوی کشیدہ کاری میں مصروف تھی۔ بچے کچھ جاگ رہے تھے، کچھ سوئے ہوئے تھے۔ ہسپتال کا عملہ سب کا سب ہندو تھا اور وہ بھی اس جگہ سے زیادہ دور نہ تھا۔

رام گوپال کے بالکل نزدیک پہنچ کر غازی نے بے خوف وخطر نعرہ لگایا:

"اللہ اکبر......"

پھر ملعون کو مخاطب کر کے پکارا:

"او گستاخِ زمانہ کافر اٹھ!...... آج محمد ﷺ کا پروانہ آہی گیا ہے۔"

غازی کی ناگہانی آواز سن کر بیوی بھی چونک اٹھی اور شوہر سے کہا:

رام گوپالا...... اٹھ کوئی مُسلہ آگیا ہے!"

ملعون رام گوپال آنکھیں ملتا اور دھوتی سنبھالتا اٹھا۔ بیوی اور نوکر چاکر مرید حسین کو پکڑنے

کے لیے لپکے، مگر انہوں نے آن کی آن میں اپنا خنجر موذی کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ وہ دھڑم سے ایسا گرا کہ پھر نہ اٹھ سکا۔ اسے قتل کرنے کے بعد غازی نے خنجر قریبی تالاب میں پھینک دیا اور خود بھی اس میں چھلانگ لگا کر تیرنے لگے۔

کچھ ہی دیر میں پولیس کی جمعیت نے تالاب کو گھیرے میں لے لیا۔

غازی مرید حسین نے پوچھا:

"تم میں کوئی مسلمان ہے؟"

اتفاق سے مقامی تھانیدار مسٹر احمد شاہ کھوٹ تھا۔ اس نے کہا:

"میں مسلمان ہوں۔"

غازی مرید حسین تالاب سے باہر آئے اور خود کو مسٹر احمد شاہ کے ہاتھوں گرفتاری کے لیے پیش کرتے ہوئے فرمایا:

"میرا نام عاشق رسول ﷺ ہے...... میں نے ہی اس ڈاکو کو قتل کیا ہے...... جس نے کروڑوں مسلمانوں کے دلوں پر ڈاکہ ڈال کر ان کا امن و سکون لوٹ لیا تھا۔"

☆......☆......☆

غازی صاحب کی والدہ، بھائی اور چوہدری محمد بخش کو اس کارنامہ کی اطلاع اخبارات سے ملی تو یہ لوگ حصار پہنچے اور ۱۲ اگست ۱۹۳۶ء کی صبح حصار ڈسٹرکٹ جیل میں غازی صاحب سے ملاقات کی۔ غازی صاحب نے انہیں دیکھتے ہی فرمایا:

"آپ کو مبارک ہو...... وہ اہم کام جس کا میں ذکر کیا کرتا تھا...... خدا کے فضل و کرم سے ہوگیا ہے۔"

مقدمے کی پیروی کے لئے ان کے بھائی لاہور سے حصار کے ایک مشہور وکیل بیرسٹر جلال الدین قریشی کے نام زمیندار اخبار کے ایڈیٹر مولانا ظفر علی خان کے فرزند اختر علی خان کا ایک خط لے گئے تھے۔ اس کے بارے میں غازی صاحب نے کہا:

"مجھے وکیل کی کوئی ضرورت نہیں...... میرا وکیل تو اللہ تعالیٰ ہے۔"

اہل خانہ قریشی صاحب سے وکالت کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے، جو غالباً اپنی مصروفیت کی وجہ سے مقدمہ کی پیروی کے لئے تیار نہ تھے۔ اتنے میں ایک بزرگ صورت مولوی صاحب تشریف لائے۔ قریشی صاحب نے ان سے غازی صاحب کے اہل خانہ کا تعارف کراتے ہوئے کہا:

"مولانا! یہ لوگ چکوال سے آئے ہیں اور بدقسمت ملزم کے لواحقین ہیں...... جس نے ڈاکٹر رام گوپال کو نارنوند میں قتل کر دیا ہے۔"

یہ سن کر مولوی صاحب سخت جلال میں آگئے ......اور فرمایا:

"جلال الدین صاحب!...... بدقسمت آپ ہیں...... بدقسمت میں ہوں، بدقسمت ہمارا سارا علاقہ

ہے، بدقسمت ہندوستان کے کروڑوں مسلمان ہیں کہ جن کی موجودگی میں گستاخ زمانہ رام گوپال دندناتا پھرتا رہا، بدقسمت اور بے غیرت تو ہم ہیں، ان کی خوش قسمتی سے کسے کلام ہوسکتا ہے، جن کے نامور فرزند نے یہاں سے سینکڑوں میل دور علاقہ چکوال سے آ کر ناموسِ رسالت کی حفاظت کا حق ادا کر دیا ہے، کیا یہ ہر مسلمان کا فرض نہیں کہ وہ حبیب کبریا حضرت محمد مصطفی ﷺ کی شان میں گستاخی کرنے والے کو حرفِ غلط کی طرح صفحہ ہستی سے مٹا ڈالے؟''

قریشی صاحب نے مولوی صاحب کے چلے جانے کے بعد بتایا کہ یہ سرسہ کے ممتاز عالم دین تھے جو انتخابات کے سلسلے میں ان سے بات چیت کرنے آئے تھے۔

مولوی صاحب کی اس سرزنش اور ڈانٹ کا یہ نتیجہ نکلا کہ قریشی صاحب نے بلا معاوضہ مقدمے کی پیروی کا ذمہ لے لیا۔ ان کے علاوہ پانچ دوسرے وکیلوں نے بھی کہا کہ وہ بھی بلا معاوضہ اس مقدمہ میں مدد کریں گے۔

حصار کی ضلع کچہری میں مقدمے کی سماعت ایک مجسٹریٹ پنڈت لکشمی دت کے ہاں شروع ہوئی لیکن ابتدائی سماعت کے بعد اس نے جلد ہی مقدمہ سیشن سپرد کر دیا۔

سیشن کورٹ میں ایک روز کاروائی جاری تھی کہ مرید حسین نے بھری عدالت میں کھڑے ہو کر فرمایا:

''ظہر کی نماز کا وقت ہو گیا ہے اس لئے مصلیٰ اور پانی کا بندوبست کیا جائے۔''

جج نے کہا:

''یہ عدالت ہے!''

غازی مرید حسین نے جواب میں فرمایا:

''میں خالق کائنات کی عدالت میں حاضری دینا چاہتا ہوں۔''

بالآخر ان کی بات مان لی گئی اور عین عدالت میں انہوں نے نماز ادا کی اور آئندہ اس کا انتظام خود بخود کر دیا جاتا رہا۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوتے تو کاروائی دوبارہ شروع کی جاتی۔

تین دن کی سماعت کے بعد، چوتھے دن فیصلہ سناتے ہوئے جج نے کہا:

''میں تمہیں سزائے موت دیتا ہوں۔''

غازی نے بلا جھجک، مسکراتے ہوئے اس فیصلے کو قبول کیا۔

اس فیصلے کے بعد ایک درخواست کے نتیجے میں مقدمے کی دوبارہ سماعت کی گئی، مگر سزائے موت برقرار رہی۔ اس پر ہائی کورٹ میں اپیل کی سماعت کی گئی۔ اس نے بھی اپیل خارج کر کے سزائے موت بحال رکھی۔

جیل کی جس کوٹھڑی میں غازی صاحب قید تھے، اس کے ساتھ والی کوٹھڑی میں قتل کا ایک ہندو

مجرم تھا۔ وہ غازی صاحب کی عبادت گزاری، شرافت اور بے باکی سے بہت متاثر ہوا۔ ایک دن اس نے دیکھا کہ غازی صاحب کا کمرہ نور سے منور ہے۔

وہ حیران اور ششدر ہو کر بولا:

”میری بھی کچھ رہنمائی کریں کہ میں آپ کا پڑوسی ہوں۔“

غازی صاحب نے فرمایا:

”رہنمائی تب ہو سکتی ہے کہ تم مسلمان ہو جاؤ۔“

ہندو قیدی نے عرض کی:

”میں روشنی کا طالب ہوں، آپ جو چاہیں کریں۔“

چنانچہ غازی صاحب کے کہنے پر ہندو نے کلمہ پڑھ کر خدا پسندیدہ دین اسلام قبول کرلیا اور غازی صاحب نے اس کا نام ”غلام رسول“ رکھا۔

قید کے دوران ہی آخری ملاقات پر والدہ محترمہ نے اپنے خوش قسمت بیٹے سے کہا:

”بیٹا، پھانسی کا پھندا خود اپنے گلے میں ڈالنا، کوئی بھنگی وغیرہ نہ ڈالے۔“

غازی صاحب نے ادب سے جواب دیا:

”ماں جی ٹھیک ہے، ایسا ہی ہوگا“۔

آخر 24 ستمبر بمطابق 18 رجب 1356ء جمعۃ المبارک کی وہ صبح آپہنچی، غازی مرید حسین جس کا انتظار بڑی بے تابی سے کر رہے تھے۔

اس دن جیل سے باہر عاشق رسول ﷺ کے عاشقوں کا ایک جم غفیر جمع تھا اور جیل کے اندر پروانہ شمعِ رسالت ﷺ پر جل مرنے کو بے تاب نظر آرہا تھا۔

جب شہادت کا وقت آیا تو آپ درود شریف پڑھ رہے تھے۔ ڈیوٹی مجسٹریٹ نے کہا:

”زبان کو حرکت نہ دیں“

غازی صاحب نے فرمایا:

”میں اپنا کام کر رہا ہوں، آپ اپنا کام کریں۔“

چند لمحوں بعد ایک خفیف سے جھٹکے اور یادگار مسکراہٹ کے ساتھ...... دیکھتے ہی دیکھتے آپ کی روح قفس عنصری سے پرواز کرگئی۔

عشق کی ایک ہی جست سے طویل سفر لمحوں میں طے ہوگیا اور غازی مرید حسین جنت الفردوس میں بسنے والے شہیدوں کی صفوں میں جا ملے۔ رحمۃ اللہ علیہ

☆......☆......☆

جنت کتنی بڑی؟

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ”جنت میں سو درجے ہیں، ہر ایک درجہ سے دوسرے درجہ کے درمیان سو سال کا فاصلہ ہے۔

ماہ رخ



پچھتاوا

بنت کامران

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دن ایک حافظ قرآن اپنے خاندان میں سے دس ایسے افراد کی سفارش کرے گا جن پر جہنم واجب ہو چکی ہوگی (یعنی ان کا جہنم میں جانے کا فیصلہ ہو چکا ہوگا) اور اللہ تعالیٰ اس کی سفارش قبول کریں گے اور ان دس افراد کو اس حافظ قرآن کے ساتھ جنت میں داخلہ نصیب فرمائیں گے۔(ترمذی، احمد)

یہ احادیث مبارکہ سنتے ہی میرے منہ سے بے اختیار نکلا میری آنکھوں سے آنسوؤں کی ایک موٹی لڑی نکلی اور زمین پر گر کر جذب ہوگئی۔ آہ۔ میں کتنا بدنصیب باپ ہوں میرے بچے آہ۔ میرے نالائق بچے۔ آج میرے کسی کام کے نہیں میں نے انہیں پالا پوسا جوان کیا۔ ان کی شادیاں کیں آج جب میرے بوڑھے جسم میں طاقت ختم ہوگئی ہے کچھ کرنے کے قابل نہیں رہا تو میرے بچوں نے مجھے گھر سے نکل جانے کی دھمکی دے دی۔ اے خدا کاش مجھے ایسے اولاد نصیب نہ کرتا اولاد تو ماں باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہوتی ہے ان کے جگر کا ٹکڑا ہوتی ہے لیکن میری اولاد۔ کاش میری اولاد بھی نیک ہوتی۔ اے کاش۔ ایک ٹھنڈی سانس بھر کے میں نے اپنا سر اوپر کیا

چاروں طرف نظریں دوڑائیں تو مسجد خالی ہو چکی تھی۔شاید نمازی نماز پڑھ کر گھروں کو چلے گئے تھے امام صاحب بھی اپنی حدیثوں والی کتاب الماری میں رکھ کر جارہے تھے۔ میں بھی دیوار کے سہارے سے اٹھا اور مسجد سے باہر نکل آیا۔

گھر پہنچ کر میں سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا، میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے جو کہ ختم ہونے کا نام ہی نہ لے رہے تھے۔ایک غم تھا جو کہ اندر ہی اندر مجھے کھائے جارہا تھا ایک چوٹ تھی جو کہ مجھ سے برداشت ہی نہیں ہو رہی تھی۔کاش کہ میں نے اپنے بچوں کو دینی تعلیم سے بھی روشناس کرایا ہوتا کاش انہیں دین اسلام کی کچھ باتیں ہی سکھادی ہوتیں، انہیں زندگی گزارنے کے کچھ طریقے ہی سکھادیئے ہوتے تو شاید میرے ساتھ یہ حال نہ ہوتا۔

ہاں غلطی میری ہی تھی میں نے انہیں شروع سے ہی شہر کے اونچے اور انگلش میڈیم اسکول میں داخل کرادیا تھا ان کا سارا نصاب تو انگلش میں تھا ہی ماحول بھی انگلش والا تھا گویا جیسے اردو لکھنا پڑھنا جانتے ہی نہ ہوں، بڑا بیٹا تھا جو تھوڑی بہت اردو سمجھ لیتا تھا چھوٹے کو تو بالکل ہی نہیں آتی تھی۔ گھر میں وہ میرے ساتھ بھی انگلش بولنے کی کوشش کرتے لیکن میں ان کو جواب اردو میں ہی دیتا تھا کتنا فخر تھا مجھے اپنے بیٹوں پر جب وہ انگلش بولتے تو میرا دل خوشی سے لبریز ہو جاتا اور میں جھوم جھوم کر ان کی اور زیادہ حوصلہ افزائی کرتا مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دفعہ میرے چھوٹے بیٹے نے مجھ سے انگلش میں میرا حال احوال پوچھا تو میں نے خوشی سے اسے گلے لگالیا اور ایک چھوٹا سا انعام بھی دیا، انعام لے کر وہ خوش ہو گیا لیکن آج جب یہ واقعہ یاد آیا تو میں بری طرح رونے لگ گیا ہائے میرے بچے۔میرے بچوں نے مجھے چھوڑ دیا صاف ظاہر ہے جب میں نے انہیں انگریزوں والی تعلیم دلوائی تو انہوں نے میرے ساتھ سلوک بھی انگریزوں والا ہی کرنا تھا۔ مجھے یہ بھی اچھی طرح یاد ہے بچپن میں میرے بچوں کو اسکول سے دو بجے چھٹی ہوا کرتی تھی اور تین بجے انہیں نے اکیڈمی پڑھنے جانا ہوتا تھا اور پھر اکیڈمی سے رات گئے واپس آتے تھے میری بیوی کچھ دین دار، سلیقہ شعار اور سمجھ رکھنے والی خاتون تھی۔ایک دفعہ مجھے کہنے لگی۔

صائم کے پاپا، بچوں کو قرآن مجید بھی پڑھنا چاہیے میں چاہتی ہوں کہ ہمارے بچے قرآن مجید بھی پڑھیں۔میں اپنی بیوی کی بات سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ان کو تو ٹائم ہی نہیں ملتا، قرآن کریم کی تعلیم وہ کیسے حاصل کریں گے۔میں نے اپنی بیوی کو یہ بات بتائی تو وہ بولی۔بچوں کے پاس دو سے تین بجے تک کا وقفہ ہوتا ہے اس دوران قاری صاحب سے بات کرآئیں تو وہ آدھا گھنٹہ دے دیا کریں۔

مجھے یہ تجویز بھلی لگی میرے گھر کے ساتھ ہی ایک اچھا سا مدرسہ تھا میں اسے مدرسے میں گیا قاری صاحب سے ملاقات کی اور اپنے بچوں کے بارے میں ان کو بتایا اور ساتھ قرآن مجید پڑھانے کی آفر بھی کی، انہوں نے وقت پوچھا تو میں نے ان کو وقت بھی بتادیا بس وقت کا سننا تھا کہ قاری صاحب نے مجھ سے معذرت کرلی کہ ہم بچوں کو کم از کم ایک گھنٹہ پڑھاتے ہیں، اس سے کم وقت میں نہیں پڑھا سکتے ،میں قاری صاحب سے آدھے گھنٹے پر ہی اصرار کرتا رہا لیکن جب وہ نہ مانے تو آخر تنگ آکر انہں نے مجھے کچھ ایسی باتیں کہیں جو کہ آج مجھے شدت سے یاد آرہی تھیں کتنی سچائی تھی ان کے کہتے ہوئے ایک لفظ میں۔ کتنی مٹھاس تھی ان کی باتوں میں ان کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ ثابت ہو رہا تھا کاش میں نے ان کی باتوں پر تھوڑا سا عمل کیا ہوتا، ان کی باتوں کو ٹھنڈے دماغ سے سوچا تو ہوتا جی چاہ رہا تھا کہ دوڑ کر جاؤں اور ان کے پاؤں چوم لوں لیکن اب تو وقت گزر گیا تھا، قاری صاحب وقت کے ساتھ ساتھ خود بھی گزر گئے تھے میں غم سے نڈھال ہو گیا اپنے آپ کو ہلکا کرلیا تھا، ہاں واقعہ قاری صاحب نے ٹھیک کہا تھا کہ دنیاوی تعلیم کو تو دیں آپ بارہ گھنٹے اور دینی تعلیم کو صرف آدھا گھنٹہ!

کامیاب انسان تو وہی ہے جس کے پاس دونوں تعلیمات ہوں جتنا وہ دنیاوی تعلیم حاصل کرنے میں لگا رہتا ہے اتنا وہ دینی تعلیم کو بھی حاصل کرے آپ نے اپنے بچوں کو انگلش اسکولوں میں تو داخل کرایا ہوا ہے بے شک آپ اپنے بچوں کو اچھی تعلیم سے روشناس کرا رہے ہیں لیکن یہ تعلیم تو اس وقت تک ہمارا ساتھ دے گی جب تک ہم زندہ رہیں گے، مرنے کے بعد تو قبر میں صرف دینی تعلیم ہی کام آئے گی کل جب ہم مرجائیں گے تو ہمارے بچے ہمیں قرآن کریم پڑھ کر ایصال ثواب تو کرسکیں گے ہمیں کفن پہنا کر دفن تو کرسکیں گے، کتنے بدنصیب ہوں گے وہ والدین جنہیں مرنے کے بعد بچوں سے کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا، بچوں کو ان کی نماز جنازہ پڑھنے کا طریقہ ہی نہیں آتا ہوگا، انہیں یہ بھی معلوم نہ ہوگا کہ ہم نے اپنے والدین کو قبر میں کیسے اتارنا ہے انہیں کیسے نہلا کر کفن پہنانا ہے۔

ہائے استغفر اللہ، میں زارو قطار رونے لگا میں ابھی زندہ ہوں، زندہ ہونے کی حالت میں بھی میرے بچوں سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہے، بعد مرنے کے کیا ہوگا۔قاری صاحب کی باتیں میرے دل پر تیر بن کر چبھ رہی تھیں آج مجھے معلوم ہو رہا تھا کہ قاری صاحب نے وہ باتیں میرے فائدے کے لیے ہی کہی تھیں، اس وقت تو میں نے قاری صاحب کی ان باتوں پر توجہ ہی نہیں دی تھی ایک

خیالی ذہن جیسی باتیں سمجھ کر واپس آگیا تھا۔ اگلے
روز میں پھر قاری صاحب کے پاس نہ گیا میں
اپنے بچوں کو اسکول باقاعدگی اور پابندی کے
ساتھ بھیجا کرتا تھا کیوں کہ مجھے معلوم تھا بلکہ میرا
خیال تھا کہ میرے بچے اچھی تعلیم حاصل کر کے کل
کو اچھے شہری اچھے انسان بن جائیں گے میرا
ارادہ تھا کہ میں اپنے بڑے بیٹے کو ڈاکٹر بناؤں گا
جو کہ بڑھاپے کی حالت میں میری خدمت کرے گا
چھوٹے بیٹے کو بھی کسی بڑے عہدے پر فائز
کرادوں گا لیکن آج جب میری خدمت کا وقت آیا
تو بچوں نے مجھ سے منہ موڑ لیا اور ایسے ناطہ توڑا کہ
پھر بیویوں کے ہو کر رہ گئے، بڑی بہو تو مجھے گھر میں
ایک بوجھ سمجھتی تھی چھوٹی بہو جب سے بیاہ کر آئی تو
اس نے آج تک مجھ سے بات تک نہیں کی تھی
اسے تو میں شروع سے ہی برا لگنے لگا تھا میری
شریک حیات بھی اس صدمے سے اس دنیا سے
چل بسی تھی چھوٹے بیٹے کو تو اپنے بزنس سے
فرصت ہی نہیں ملتی تھی اس نے تو آج تک میری
خدمت بھی صحیح طرح نہ کی ہر وقت پیسہ کمانے کے
چکر میں پڑا رہتا، بڑا بیٹا بھی اپنی مصروفیت کے
باعث مجھ سے نہ مل سکتا تھا اے خدائے پاک
میں کیا کروں۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری
ہو گئے میں صدمے سے پاگل ہوا جارہا تھا اسے
کاش جب میں مرجاؤں گا میرے بچوں کو اتنی بھی
فرصت نہیں ہوگی کہ میری نماز جنازہ پڑھ سکیں
اور مجھے صحیح طرح سے دفنا سکیں اے کاش،

پچھتانے کے سوا اب تو کوئی چارہ ہی نہیں
وقت تو گزر گیا تھا مجھے بار بار وہ احادیث مبارکہ یاد
آرہی تھی جو کہ میں نے مسجد میں سنی تھیں جس میں یہ
ذکر تھا کہ قرآن مجید پڑھنے والا شخص جس پر وہ
عمل بھی کرے اس کے والدین کو قیامت کے
دن ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی روشنی سورج کی
روشنی سے زیادہ ہوگی۔ آہ کتنے خوش نصیب ہوں
گے وہ والدین جس کے بچوں نے قرآن مجید
پڑھا ہوگا۔ اسے یاد کیا ہوگا اور اس پر عمل کیا ہوگا
میں ہی بدنصیب ہوں جو کہ اپنے بچوں کو قرآن
کریم نہیں پڑھا سکا۔ آج ان کی یہ تعلیم میرے کس
کام کی میرے بڑے بیٹے کا ڈاکٹر بننا میرے کس
کام کا کہ میں بیمار ہو جاؤں اور وہ میرا علاج نہ
کر سکے، چھوٹے بیٹے کا بزنس سنبھالنا میرے کس
کام کا مجھے تو آج تک یہ بھی یاد نہیں کہ اس نے مجھ
پر کچھ خرچ بھی کیا یا کوئی مجھے پھوٹی کوڑی دی
ہو حالاں کہ اس کا کاروبار کتنا وسیع تھا۔ کاش میں
نے انہیں دین اسلام کی کچھ باتیں ہی سکھادی
ہوتیں انہیں یہ تو سمجھا دیا ہوتا تاکہ والدین کی
خدمت کرنے پر اللہ تعالیٰ نے کیا کیا انعامات
رکھے ہیں تو شاید آج میرا یہ حال نہ ہوگا۔ اے خدا
مجھے معاف فرما۔ آمین



43

سلطان ٹیپو شہید رحمۃ اللہ

عبدالحفیظ امیر پوری

اپنا نام سن کر نجیب الدولہ انتہائی بدحواسی کے عالم میں پلٹا۔ اس کے قریب ہی شجاعت خان ایک ہندو کے لباس میں کھڑا تھا۔ نجیب الدولہ نے اسے پہچان گیا مگر فوراً ہی بات بدل کر بولا۔

''میرا نام نجیب الدولہ نہیں ہے۔''

''مگر شکل تو اسی جیسی ہے۔''

شجاعت خان مسکرایا۔

''میسور کے رئیس اعظم! چپ چاپ میرے ساتھ محل میں چلے چلو! تمہارے چاروں طرف میسور کے جانباز سپاہیوں کا حصار ہے۔ اگر اس حصار کو توڑنے کی کوشش کی تو جان سے جاؤ گے۔''

ٹیپو سلطان نے تمام واقعات سنے تو وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ پھر شدت نفرت وغضب سے اس کا چہرہ جلنے لگا۔

''عم محترم! اب نجیب الدولہ کے قتل کرنے میں کیا عذر مانع ہے؟'' ٹیپو احتراماً اپنے اتالیق حیات شجاعت خان کو چچا کہہ کر پکارتا تھا اور اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حیدر علی، شجاعت خان کو بھائی کہتا تھا۔

''نہیں شہزادے! اتنی جلد بازی ٹھیک نہیں'' شجاعت خان نے بزرگانہ لہجے میں ٹیپو کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''مجرم ہاتھ آگیا ہے، اس کی قسمت کا فیصلہ خود نواب بہادر کریں گے۔''

''نواب بہادر اسے معاف تو نہیں کر دیں گے؟'' ٹیپو فکرمند نظر آرہا تھا۔

''شہزادے! تم نجیب الدولہ کے بارے میں اتنے پریشان کیوں ہو رہے ہو؟'' شجاعت خان نے ولی عہد سلطنت سے پوچھا۔

''میں اُسے خاک وخون میں نہایا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں، اس کے سوا میری کوئی خواہش نہیں۔''

ٹیپو کا چہرہ بھی جل رہا تھا اور لہجہ بھی۔

شجاعت خان نے بڑی عجیب نظروں سے ٹیپو سلطان کی طرف دیکھا اور پھر کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''اس کا جرم بہت سنگین ہے۔ نجیب الدولہ اس جرم کی پاداش میں زندہ نہیں بچے گا۔''

''وہ کس طرح؟'' ٹیپو ساری تفصیلات جاننے کے لئے بے قرار نظر آ رہا تھا۔ شجاعت خان نے وہ طویل خط ولی عہد سلطنت کے سامنے رکھ دیا جو امیر نجیب الدولہ نے نواب ارکاٹ کے خط کے جواب میں تحریر کیا تھا۔

''حضور والا! آپ کا غضب نامہ موصول ہوا۔ بے شک! میں اپنا وعدہ وفا نہ کر سکا۔ مگر مجھ پر بے پروائی اور کاہلی کا الزام سراسر غلط ہے۔ حیدر علی کو قتل کرنا اتنا آسان نہیں جتنا آپ سمجھ رہے ہیں۔ میں نواب میسور کے خاص خدمت گاروں کو خریدنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس کے لئے لاکھوں کی رقم درکار ہو گی۔ آپ جلد از جلد مجھے مطلوبہ رقم فراہم کر دیجئے۔ پھر جس روز حیدر علی کے خدام میرے ہاتھوں اپنے ضمیر فروخت کر دیں گے، اسی دن والیٔ میسور کا کام تمام ہو جائے گا۔''

یہ وہ خط تھا جو تلاشی کے وقت نجیب الدولہ کی جیب سے برآمد ہوا تھا اور اس خط کو نواب ارکاٹ تک پہنچانے کے لئے نجیب الدولہ، سری رنگ ناتھ کے مندر پہنچا تھا۔

مگر شجاعت خان نے بروقت اقدام کر کے اس کا سارا منصوبہ اُلٹ دیا تھا۔ نجیب الدولہ کا خط پڑھ کر ٹیپو سلطان کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

''معاذ اللہ! مسلمانوں کے بھیس میں ایسے ایسے غدار بھی موجود ہیں۔ شہزادے! ایسا لگتا ہے کہ جیسے دنیا بھر کے غدار ہمارے ہی حصے میں آئے ہیں۔'' شجاعت خان کے لہجے میں بڑی خلش تھی۔

''نواب بہادر نے ہندوستان کے مسلمانوں کو متحد کرنے کے لئے بڑے دُکھ برداشت کئے ہیں۔ مگر جب تک اس زمین پر نواب ارکاٹ نظام دکن اور نجیب الدولہ جیسے بے ضمیر انسان موجود ہیں، اس وقت تک ہم سب کے دل سلگتے ہی رہیں گے اور ہمارے سینوں سے دھواں اٹھتا ہی رہے گا۔ خدا نہ کرے کہ یہ دھواں کسی دن پورے ہندوستان پر چھا جائے اور مسلمانوں کی تقدیریں اسی کثیف دھوئیں کا ایک حصہ بن کر رہ جائیں۔''

شجاعت خان کی گفتگو سن کر ٹیپو سلطان بھی اُداس نظر آنے لگا تھا۔

''نہیں شہزادے! تمہیں اتنا غم زدہ نہیں ہونا چاہئے۔'' فرط محبت میں شجاعت خان، ولی عہد سلطنت کے رخساروں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

''میں یہ سارے واقعات اس لئے دہراتا ہوں کہ تم اپنے ذہن کو ہر صورت حال کے لئے آمادہ کر سکو۔ جب تک تمہارے بزرگ زندہ ہیں، تمہیں مضطرب ہونے کی ضرورت نہیں۔''

نجیب الدولہ کے مکان پر سپاہیوں کا سخت پہرہ لگا دیا گیا تھا اور خود امیر کو محل کے ایک محفوظ

ترین تہہ خانے میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ نجیب الدولہ نے کئی بار شجاعت خان کو پیشکش کی تھی۔

”مجھے مرنے سے بچا لے شجاعت خان!“

یہ کہتے کہتے امیر رونے لگا۔

”میرے پاس جو کچھ ہے، وہ سب تیرا ہے۔ یہ سیم وزر کے انبار، یہ عالی شان حویلی، میں ایک ایک چیز تیرے نام کر دوں گا۔ بس مجھے دو کپڑوں میں یہاں سے چلا جانے دے۔“

”نجیب الدولہ! تیری پیش کردہ رشوت بہت کم ہے اور میری قیمت بہت زیادہ“ شجاعت خان بڑے عجیب انداز میں مسکرایا۔

”پہلے ساری دنیا کے خزانے جمع کر لے، پھر میرے ظرف کو آزمانا۔ اس کے بعد تجھے اندازہ ہوگا کہ میں کون ہوں۔“

نجیب الدولہ اپنی زندگی سے مایوس ہو گیا تھا، اس لئے موت کو یاد کر کے دن رات رویا کرتا تھا۔ کبھی کبھی اس پر ہذیان کا دورہ پڑتا اور زندان کی دیواروں سے سر ٹکرا کر چیخنے لگتا۔

”حرام کارو! تمہاری رفاقت نے مجھے اس جہنم تک پہنچا دیا۔ تم کہاں ہو؟ اور میری مدد کو کیوں نہیں آتے؟“ امیر نجیب الدولہ غائبانہ طور پر نواب ارکاٹ اور نظام دکن کو گالیاں دیا کرتا تھا۔

ان دونوں حاکموں نے نجیب الدولہ کو یقین دلایا تھا کہ اگر وہ جاسوسی کے دوران پکڑا گیا تو نواب ارکاٹ اور نظام دکن، حیدر علی پر سفارتی دباؤ ڈال کر اس کی جان بچائیں گے۔ بالفرض حیدر علی نے اس دباؤ کو قبول نہیں کیا تو وہ دونوں مل کر میسور پر حملہ کر دیں گے اور اسے حیدر علی کی گرفت سے چھڑا لیں گے۔

امیر نجیب الدولہ کو تہہ خانے کی تاریکیوں میں والا جاہ محمد علی اور نظام علی خان کے عہد و پیمان یاد آرہے تھے اور اسی وجہ سے وہ شدید حالت اضطرار میں اپنے دونوں آقاؤں کو مدد کے لئے پکار رہا تھا مگر نواب ارکاٹ اور نظام دکن کسی طرح اس کی مدد کو آتے؟ وہ تو خود انگریزوں کے پیروں پر سر رکھے نواب حیدر علی کی تباہی و بربادی کی بھیک مانگ رہے تھے۔

☆---☆---☆

انگریز کئی ایسی شرائط پیش کر چکے تھے جو نواب حیدر علی کے لئے قابل قبول نہیں تھیں۔ آخر گورنر مدراس نے شدید بے چارگی کے عالم میں کہا۔

”نواب بہادر! آپ خود ہی شرائط تحریر فرما دیں۔ میں کسی حیل و حجت کے بغیر معاہدے پر دستخط کر دوں گا۔“

گورنر مدراس کو معلوم تھا کہ حیدر علی پڑھنا لکھنا نہیں جانتا اس لئے وہ والی میسور کی مجبوری کا تماشا دیکھنا چاہتا تھا۔

حیدر علی نے فوراً میر علی رضا خان کی طرف دیکھا۔ میر علی رضا خان، فاطمہ بیگم کا حقیقی بھائی اور ٹیپو سلطان کا حقیقی ماموں تھا۔ میر علی رضا خان نے

گورنر مدراس سے کاغذ، قلم اور دوات طلب کیے۔ پھر حیدر علی بولتا رہا اور میر علی رضا خان لکھتا رہا۔

"آئندہ دونوں فریق ایک دوسرے کے مددگار رہیں گے۔ دونوں فریق مقبوضہ علاقے اور جنگی قیدی واپس کر دیں گے۔ کرور کا علاقہ جو والا جاہ محمد علی کی ملکیت تھا، آئندہ نواب حیدر علی کی ملکیت قرار پائے گا"

معاہدے کی آخری شرط یہ تھی کہ والا جاہ محمد علی، نواب حیدر علی کو چھ لاکھ روپے سالانہ نعل بندی کے طور پر ادا کرے گا۔

گورنر مدراس نے شرائط نامہ پڑھا تو اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک ان پڑھ حکمراں اتنا بڑا مدبر ثابت ہوگا۔ حیدر علی نے بڑی ہوشیاری سے انگریزوں کو نواب ارکاٹ اور نظام دکن سے الگ کر دیا تھا۔

"نواب بہادر! یہ شرائط بہت سخت ہیں" گورنر نے شکستہ لہجے میں کہا۔

"تو پھر میں واپس جا رہا ہوں" نواب حیدر علی ناگواری کے عالم میں اپنی نشست پر کھڑا ہو گیا۔ مگر یاد رکھنا کہ بہت جلد دوبارہ مدراس آؤں گا۔

"پھر میں اپنی تلوار کی نوک اور بارود کی سیاہی سے دوسرا معاہدہ تحریر کروں گا"

آخر گورنر مدراس نے والیٔ میسور کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ اس نے دستخط کرنے کے لیے قلم اٹھایا تو حیدر علی نے اسے یہ کہہ کر روک دیا۔

"میں کمپنی کو فریق تسلیم نہیں کرتا، اس لئے یہ معاہدہ میرے اور شاہ انگلستان کے درمیان تحریر کیا جائے"

نواب حیدر علی کے حکم پر معاہدے کی عبارت تبدیل کی گئی اور گورنر مدراس نے شاہ انگلستان کی طرف سے دستخط کئے۔ اس کے بعد حیدر علی نے دستاویز پر دو آڑی لکیریں کھینچ کر اپنے دستخط ثبت کر دیے۔

گورنر مدراس ہنس پڑا۔

حیدر علی اُس کی ہنسی کا مفہوم سمجھتا تھا۔

"کاغذ کی لکیروں کو کیا دیکھتا ہے؟ میری پیشانی کی لکیروں کو دیکھ، جنہیں قدرت نے اپنے ہاتھ سے کھینچا ہے۔" حیدر علی کی پر جلال آواز سن کر دربار پر سناٹا چھا گیا اور گورنر مدراس نے احساس ندامت سے سر جھکا لیا۔

گورنر کے دربار میں موجود تمام انگریز بجھے بجھے نظر آ رہے تھے اور اس وقت انگریزوں کے پیچ و تاب میں مزید اضافہ ہو گیا، جب حیدر علی کے حکم پر پتھر کا ایک کتبہ تیار کیا گیا۔

اس کتبے میں گورنر مدراس اور کونسل کے اراکین، حیدر علی کے سامنے دو زانو بیٹھے ہیں۔ والیٔ میسور ایک ممبر کی ناک جو ہاتھی کی سونڈ کے مشابہ ہے، پکڑ کر کھینچ رہا ہے اور اس میں سے اشرفیاں گر رہی ہیں۔ تصویر کے کونے میں کرنل اسمتھ صلح نامہ لئے کھڑا ہے اور دوسرے ہاتھ سے تلوار توڑ کر زمین پر رکھ رہا ہے۔

اس منظر کو مدراس کے ایک ماہر سنگ تراش نے بڑی خوب صورتی سے پتھر پر منتقل کیا تھا۔ حیدر علی نے سنگ تراش کو بڑے انعام و اکرام سے نوازا اور پھر یہ کتبہ قلعہ سینٹ جارج کے دروازے پر نصب کیا گیا۔ انگریزوں کی یہ دوسری شکست تھی۔ نواب حیدر علی نے دشمن کے گھر میں بیٹھ کر اپنے جلال و جبروت کا عجیب مظاہرہ کیا تھا۔

☆۔۔۔☆۔۔۔☆

پھر جب انگریزوں سے معاہدہ کرنے کے بعد حیدر علی سرنگا پٹم پہنچا تو اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔ والیٔ میسور کے جلوس پر کسی عالی مرتبت شہنشاہ کے جلوس کا گمان ہوتا تھا۔

ٹیپو سلطان اور شجاعت خان نے سرنگا پٹم کی حدود سے نکل کر نواب حیدر علی کا استقبال کیا۔ والیٔ میسور کی بحفاظت واپسی کی خوشی میں مجیدہ بیگم اور فاطمہ بیگم نے غریبوں اور محتاجوں میں ہزاروں روپے، اناج اور کپڑے تقسیم کئے۔

محل پہنچتے ہی نواب حیدر علی سب سے پہلے نواب مظفر جنگ مرحوم کی بیوہ، رافعہ خاتون اور بیٹی حمیدہ خاتون سے ملا۔ رافعہ خاتون نے پردے کی آڑ سے نواب حیدر علی کا شکریہ ادا کیا۔

”برادر اور معظم! میں آپ کی اس عنایت کو تاحیات فراموش نہ کرسکوں گی کہ آپ نے مجھے اذیت و کرب کی زنجیروں اور رسوائی کے زنداں سے نجات دلائی۔“

”یہ ایک بھائی کی اپنی بہن کے لئے انتہائی حقیر کوشش تھی۔“ نواب حیدر علی نے انکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

پھر حمیدہ خاتون پردے سے باہر آئی اور حیدر علی کے سینے سے لگ کر رونے لگی۔

والیٔ میسور اس لڑکی کو دیکھ کر خود بھی آبدیدہ ہو گیا جو ذاتی غموں کو بھول کر اپنے سینے میں ملت اسلامیہ کا درد رکھتی تھی۔

”بیٹی! میں تیرا باپ تو نہیں، مگر تجھے دیکھ کر حسرت کرتا ہوں، کاش تو میری بیٹی ہوتی۔ مجھے تجھ پر فخر ہے۔“

”میں آپ ہی کی بیٹی ہوں اور آپ میرے روحانی باپ ہیں۔“ حمیدہ خاتون نے اشکبار آنکھوں کے ساتھ کہا۔

”آپ جیسا ہندوستان میں کوئی دوسرا نہیں۔ خدا آپ کے بازوؤں کو اتنی طاقت دے کہ ہندوستان کے بکھرے ہوئے مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کردیں۔

آپ کے خواب، میرے باپ کے خوابوں سے عظیم تر ہیں۔ والد محترم صرف ارض دکن کے استحکام کے بارے میں سوچتے تھے، مگر آپ ایک ایک مسلمان کے درد کو محسوس کرتے ہیں۔“

☆۔۔۔☆۔۔۔☆

بہادر کون

فاطمہ اعظم

عمر، احسن، حسن اور احمد چاروں کے گھر ایک ساتھ تھے۔ عصر کے بعد سب بچے گراؤنڈ میں جمع ہوتے اور فٹبال کھیلتے، چاروں کے گھر گراؤنڈ کے بالکل سامنے ہی تھے۔

اس لیے ان کے والدین اپنی نگرانی میں کھیلنے کی اجازت دے دیتے۔

آج بھی سب جمع ہوئے تو احسن بولا۔

"یار! آج کوئی اور کھیل کھیلتے ہیں۔"

"چلو آج دیکھتے ہیں کہ کون سب سے زیادہ بہادر ہے؟" ساتھ ہی چہکتے ہوئے بولا۔

"ہاں! ٹھیک ہے" حسن احسن کا بھائی جس پر ہر وقت بہادر بننے کا بھوت سوار رہتا تھا۔ ہاں میں ہاں ملائی۔

"میں تو بریڈ مین ہوں" ہاتھ میں بریڈ مین والی گھڑی پہنے حسن اسی کارٹون کے انداز میں کھڑا ہوا۔

"اور میں سپر مین۔"

احسن نے پی کیپ سے ایکشن مارتے ہوئے ایک نئے اسٹائل سے کہا۔

"اور آپ سب تو کارٹونز ہی بنو میں تو سلمان خان ہوں۔" احمد نے کہا جو کہ فلموں کا شوقین تھا اور ویسے ہی ہر وقت ڈائیلاگ مارتا رہتا۔

"ارے! آپ سب کو یہ نام کہاں سے آئے



اور یہ ہیں کون؟ مجھے بھی توان کا تعارف کرواؤ!''

یہ عمر تھا جو مدرسہ میں حفظ کرتا تھا۔تینوں نے حیرانی سے عمر کی طرف دیکھا۔

''تم ٹی وی نہیں دیکھتے کیا؟''

''نہیں یار! مجھے تو قاری صاحب نے منع کیا ہے ٹی وی دیکھنے سے اور ویسے بھی ہمارے گھر میں ٹی وی نہیں ہے۔''

''اوہ اچھا! تو پھر ایسا کرو کسی بہادر انسان کا نام بتاؤ جس سے تم بہت زیادہ متاثر ہوئے ہو اور ویسا بننے کی تمہیں بھی خواہش ہو، جیسے مجھے سلمان خان کی طرح بننے کی خواہش ہے اور یہ ایک فلم اسٹار ہے۔

وہ تو ایک مکہ مار کر بندے کے سارے دانت توڑ دیتا ہے اور ایک لات مار کر دروازہ توڑ دیتا ہے۔''احمد نے جوش میں پتھر پر لات مار کر نقل اتارنا چاہی اور اسے پتہ نہیں چلا کہ ساتھ میں پڑا کانٹا اس کا جوتہ چیرتا ہوا اس کے پاؤں میں چبھ گیا۔

''اووی ئی۔۔۔'' کرتا ہوا وہ ادھر ہی بیٹھ گیا۔ قبل اس کے کہ دوسرے بھی اپنی بہادری دکھاتے۔سب ادھر ہی بیٹھ کر اس کے پاؤں کا معائنہ کرنے لگے۔

عمر نے بڑھ کر کانٹا نکالا اور اس کے پاؤں پر رومال باندھ دیا۔تب احمد کی جان میں جان آئی۔چاروں ادھر ہی بیٹھ گئے۔

''اچھا! چلو عمر! تم بھی تو کوئی نام بتاؤ!''احسن عمر کی طرف متوجہ ہوا۔احمد اور حسن نے بھی اشتیاق سے دیکھا۔

''میں تو اپنے نام کی طرح بہادر بننا چاہتا ہوں''

''اچھا!!!''احمد نے سمجھنے والے انداز میں اچھا کو لمبا کرتے ہوئے کہا۔

''کل قاری صاحب نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے یوم وفات پر ہمیں ان کے واقعات سنائے۔ بہت بہادر اور عظیم انسان تھے وہ۔بس اسی لیے میں ان کی بہادری سے متاثر ہوا اور ان جیسا ہی بننے کی خواہش ہے۔''

''اچھا ہمیں بھی تو سناؤ نا یار!!!''

دلچسپی سے سب نے کہا۔

''حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اسلام لانا گویا کہ اسلام کی فتح تھی۔ آپ کی ہجرت نصرت تھی،آپ کی امامت رحمت تھی۔ہم میں یہ ہمت و طاقت نہ تھی کہ ہم بیت اللہ شریف میں نماز پڑھ سکیں،لیکن جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا تو ہمارے لیے بیت اللہ میں نماز اداء کرنا ممکن ہوگیا۔آپ نے مشرکین سے اس قدر قتال وجدال کیا کہ انہوں نے عاجز آکر ہمارا پیچھا چھوڑ دیا اور ہم اطمینان سے بیت اللہ میں عبادت کرنے لگے اور کسی بزدل میں عمر رضی اللہ عنہ کا سامنا کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

مشرف باسلام ہونے سے قبل مشرکین کی باتوں میں آ کر جب نعوذ باللہ حضور سرور کونین ﷺ کو قتل کرنے کے ارادے سے نکلے۔ جب پیارے نبی ﷺ سے سامنا ہوا تو بہادر عمر رضی اللہ عنہ پر لرزہ طاری ہوگیا اور اسلام کے دامن رحمت میں تشریف لے آئے۔

آپ ﷺ اپنی زبان مبارک سے بھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لیے دعا کیا کرتے تھے۔

اسلام قبول کرنے کے بعد آپ ﷺ پر جان تک قربان کرنے کے لیے تیار ہوگئے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سوا ہم کسی ایسے شخص کو نہیں جانتے جس نے اعلانیہ ہجرت کی ہو۔ جب وہ ہجرت کے ارادے سے نکلے تو اپنی تلوار لہرا کر مشرکین کو للکارتے ہوئے فرمایا:

”تمہارا ناس ہو! جو کوئی تم میں سے اپنے بچوں کو یتیم کروانا چاہتا ہو یا اپنی ماں کو بیٹے کی موت پر رلانے کا ارادہ ہو یا بچوں کو یتیم اور بیوی کو بیوہ کروانا چاہتا ہو وہ آ کر مجھ سے مقابلہ کرلے۔ کسی ماں کے لعل میں بھی مقابلہ میں آنے کی ہمت نہ ہوئی۔“

عمر کے چہرے پر ایک عزم اور جذبہ واضح دیکھائی دے رہا تھا۔ اس نے رک کر تینوں دوستوں کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

”واقعی آئیڈیل تو ایسی ہی ہستی ہونی چاہیے۔“

احسن نے پرسوچ انداز میں کہا۔

عمر نے ان کو ایک نئی راہ دکھائی تھی جس میں ان کی دنیا اور آخرت کی رہنمائی تھی۔ گھر لوٹتے ہوئے ان کی خواہش بدل چکی تھی۔

سچ ہی تو کہا ہے! نقل کے لیے عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔

عمر رضی اللہ عنہ ہی ہیں وہ۔۔۔!

کفار و مشرک جس سے کانپ اٹھیں وہ نام کیا ہے
عمر، عمر، عمر ہی ہیں وہ
محافظ ایسے کہ عوام خوش ہوں وہ حکمراں ہیں
عمر، عمر، عمر ہی ہیں وہ
بلند عزم ہے پہاڑ جیسا، دبدبہ ہے شیر جیسا
عمر، عمر، عمر ہی ہیں وہ
حق و باطل میں فرق کر گئے تلوار وہ بلند کر گئے
عمر، عمر، عمر ہی ہیں وہ
شیطان راستہ بدل لے محسوس ہو جب ان کی آہٹ
عمر، عمر، عمر ہی ہیں وہ
تلوار لہرائے آرہے ہیں وہ
مشرکین بلوں میں گھس رہے ہیں
عمر، عمر، عمر ہی ہیں وہ
جو تم سے پوچھے بہادری کا تو کہہ دو تم بھی
عمر، عمر، عمر ہی ہیں وہ

☆۔۔۔☆۔۔۔☆

☆۔۔۔☆۔۔۔☆



خوش بخت

انتخاب: حبیب احمد ملوانی

"میاں لڑکے! کیا تم بکری کا دودھ دوہ کر ہماری پیاس بجھا سکتے ہو؟"

درمیانہ سا قد اور گندمی رنگ کے لڑکے نے چونک کر نظریں اٹھائیں۔ تو اس کے سامنے دو نورانی چہروں والے کھڑے تھے۔

فوراً اس نے کہا، یہ بکریاں میری نہیں ہیں۔ عقبہ بن ابی معید (مکہ کے مشہور مشرک) کی ہیں۔ میں تو صرف چرواہا ہوں۔

اس کی اجازت کے بغیر میں آپ کو دودھ نہیں پلا سکتا، یہ امانت میں خیانت ہوگی۔

اب دوسرے صاحب بولے،

اچھا تو بھائی کوئی ایسی بکری آگے لاؤ جو دودھ نہ دیتی ہو۔

اس پر چرواہے نے کہا، ایسی بکری ہے تو سہی، لیکن آپ کے کس کام کی؟

وہ صاحب بولے، تم لاؤ تو سہی۔ چرواہے نے بکری آگے کر دی۔

یہ اسلام کی تبلیغ کا بالکل ابتدائی دور تھا۔ یہ دو حضرات نبی کریم ﷺ اور حضرت ابوبکر صدیق



رضی اللہ عنہ تھے۔ آپ دونوں تبلیغ کرنے دور نکل آئے تھے۔ پیاس لگی، پانی کی تلاش میں نظریں دوڑائیں، پانی تو نظر نہ آیا مگر چرواہے اور اسکی بکریوں پر نظر پڑی، چنانچہ اس کے نزدیک آ گئے۔ اب چرواہا حیران تھا کہ یہ اس بکری کا کیا کریں گے جس نے آج تک دودھ نہیں دیا۔

اس نے دیکھا، ان صاحب نے بکری کے تھنوں پر ہاتھ پھیرا اور دعا کی، دیکھتے ہی دیکھتے تھن دودھ سے بھر گئے۔

اب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بکری کا دودھ دوہنے لگے۔ اتنا دودھ ہو گیا کہ تینوں نے خوب سیر ہو کر پیا۔

اس کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہم نے دعا کی۔ بکری کے تھن اپنی پہلی حالت پر آ گئے۔

نوجوان پہلے ہی کچھ کم حیرت زدہ نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر اور حیران ہو گیا۔ مکہ میں اسلام کی دعوت کی بات اس کے کانوں میں بھی پڑ چکی تھی۔

وہ سمجھ گیا کہ یہ وہی ہیں۔ دودھ والا معجزہ دیکھ کر وہ خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس وقت تو خاموش رہا۔ شہر واپس جا کر نبی کریم صلی اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہو کر بولا:

''اے اللہ کے رسول ﷺ مجھے بھی اپنی جماعت میں شریک کر لیجیے!''

نبی کریم ﷺ چرواہے کو دیکھ کر مسکرائے۔ اس کی ایمانداری پہلے ہی دیکھ چکے تھے، اسے کلمہ پڑھایا، سر پر محبت سے ہاتھ پھیرا اور فرمایا:

''تم تعلیم یافتہ لڑکے ہو؟''

یہ خوش قسمت انسان حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تھے۔ ایمان لانے کے بعد حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے خود کو نبی اکرم ﷺ کی خدمت کے لیے وقف کر دیا اور ذوق و شوق سے قرآن کی تعلیم حاصل کرنے لگے۔ اس وقت تک صرف چند افراد ہی ایمان کی دولت سے مالا مال ہوئے تھے۔

ایک دن ان حضرات نے آپس میں مشورہ کیا کہ قریش نے آج تک بلند آواز سے قرآن پڑھتے ہوئے کسی کو نہیں سنا۔ کوئی ان کے سامنے بلند آواز میں قرآن پڑھے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فوراً کہا یہ کام میں کروں گا۔

اس پر صحابہؓ نے ان سے کہا: یہ کام بہت خطرناک ہے، ایسا نہ ہو کہ تم کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ، تمھارا قبیلہ اتنا طاقتور نہیں ہے کہ تمہیں مشرکین سے چھڑا سکے، ان کی بات سن کر حضرت عبداللہ بن مسعود نے پر جوش انداز میں کہا، آپ لوگ مجھے یہ کام کرنے دیں۔

دوسرے دن سورج طلوع ہونے کے بعد جب مشرکین مکہ ایک جگہ جمع تھے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے

نہایت بلند آواز میں ان کے سامنے قرآن کی تلاوت شروع کردی۔

ان میں سے ایک نے کہا: یہ تو وہ کتاب پڑھ رہا ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر اتری ہے؟

یہ سنتے ہی تمام مشرکین غصے میں بھر گئے اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ پر ٹوٹ پڑے۔ انھیں اس قدر مارا کہ ان کا چہرہ سوج گیا، جسم کے کئی حصوں سے خون بہنے لگا۔

لیکن انہوں نے قرآن کی تلاوت نہ روکی تلاوت کرتے جاتے تھے اور مار کھاتے جاتے تھے حتی کہ مشرکین مارتے مارتے تھک گئے۔

عبداللہ بن مسعودؓ اس وقت خاموش ہوئے جب سورۃ ختم ہوگئی۔

خستہ حالت میں واپس لوٹے صحابہ رضی اللہ عنہم نے دیکھ کر کہا، ہمیں اس بات کا ڈر تھا۔ یہ سن کر انھوں نے پرجوش انداز میں کہا، میں نے تو کل کا بھی ارادہ کرلیا ہے، کل پھر انھیں اللہ کا کلام سناؤں گا۔ صحابہ نے کہا، جتنا تم نے کیا کافی ہے۔

اپنے ساتھیوں کے مجبور کرنے پر حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ رک گئے، کفار بھلا کب آرام سے بیٹھنے والے تھے۔ انھوں نے انھیں ستانے پر کمر کس لی۔ جب ان کا ظلم حد سے بڑھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں حبشہ کی طرف ہجرت کر نے کی ہدایت فرمائی۔

آپ نے دو مرتبہ حبشہ کی طرف ہجرت کی اور تیسری مرتبہ مدینہ کی طرف۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھائی چارہ کرایا تو انہیں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ انصاری کا بھائی بنایا۔ ان کے رہنے کے لیے مسجد نبوی کے پاس زمین کا ایک ٹکڑا عنایت فرمایا۔

2 ہجری سے غزوات کا سلسلہ شروع ہوا۔ غزوہ بدر میں جب دو بچوں نے ابوجہل کو شدید زخمی کردیا تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بھی ابوجہل کو تلاش کرتے وہاں پہنچ گئے، ابوجہل دم توڑتا نظر آیا۔ آپؓ نے اس کا سر کاٹ لیا اور لاکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدموں میں رکھ دیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابوجہل کی لاش کو دیکھ کر فرمایا:

''حمد وثنا کے لائق ہے وہ ذات جس نے اے اللہ کے دشمن تجھے ذلیل کیا۔ پھر فرمایا: اس امت کا فرعون مرگیا۔''

غزوہ بدر کے بعد حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نہایت جوش اور جواں مردی کے ساتھ احد، خندق اور خیبر کی لڑائیوں میں حصہ لیا۔

حدیبیہ اور فتح مکہ کے موقع پر بھی آپ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ تھے۔

8 ہجری میں حنین کا معرکہ پیش آیا۔ ہوازن اور ثقیف کے جنگجوؤں کو شیطان نے بہکایا۔ انھوں نے دوسرے قبیلوں کو ساتھ ملایا اور ہزار ہا جنگجو مکہ کی طرف بڑھے۔

نبی پاک ﷺ کو اطلاعات ملیں تو آپ ﷺ نے جنگ کی تیاری کی اور بارہ ہزار صحابہ رضی اللہ عنہم کو ساتھ لے کر مکہ سے روانہ ہوئے۔ اسلامی فوج میں مکہ کے دو ہزار نئے مسلمان بھی شامل ہو گئے۔ اتنا بڑا لشکر دیکھ کر مسلمانوں کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے:

''اب ہمیں کون شکست دے سکتا ہے؟''

اللہ کو غرور کے انداز میں کہی گئی یہ بات پسند نہ آئی۔ اسلامی لشکر حنین کی وادی میں پہنچا۔

وادی کے دونوں طرف دشمن چھپا ہوا تھا۔ مسلمان اس بات سے بالکل بے خبر تھے۔ آگے بڑھتے چلے گئے۔

پھر جونہی ان کا ہراول دستہ دشمن کی زد میں آیا۔ انھوں نے تیروں کی بارش کر دی، پھر نکل کر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے۔ اول دستہ میں زیادہ تر نئے مسلمان تھے۔

وہ بوکھلا کر بھاگے تو دوسرے مسلمان بھی گھیرے میں آ گئے۔

ان میں سے اکثر کے قدم اکھڑ گئے۔

اس نازک وقت میں نبی کریم ﷺ میدان میں جم کر کھڑے رہے۔

صحابہ کرام کی ایک مختصر سی جماعت آپ ﷺ کے گرد جان نثاری کے جوہر دکھا رہیں تھی۔

ان میں حضرت ابوبکر حضرت عمر، حضرت علیؓ حضرت عباس اور حضرت عبد اللہ شامل تھے۔

ایسے میں آپ ﷺ نے فرمایا:

''عبد اللہ مجھے ایک مٹھی خاک دو! انہوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔

آپ ﷺ نے یہ خاک مشرکین پر پھینکی، اللہ نے ان کی آنکھیں غبار آلود کر دیں۔ ساتھ ہی تمام مسلمان واپس پلٹ پڑے اور کفار پر زبر دست حملہ کر دیا۔

مشرکین نے بری طرح شکست کھائی۔ اپنے بے شمار مقتولین اور زخمیوں کو میدان میں چھوڑ کر بھاگ نکلے۔

نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد بھی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں یرموک کی لڑائی میں حصہ لیا۔ واپس آئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انھیں کوفہ کا قاضی مقرر کیا۔

وہاں کا بیت المال اور دینی تعلیم کا شعبہ بھی آپ کے سپرد کیا۔ دس سال تک قاضی رہے۔

حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اس عہدے سے فارغ ہوئے۔ حج کے لیے قافلہ کے ساتھ روانہ ہوئے، راستے میں ایک مقام زبدہ سے گزرے، وہاں ایک خاتون بیٹھی نظر آئیں۔

اس نے ان مسلمانوں کو پکارا۔ معلوم ہوا وہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی زوجہ ہیں اور حضرت ابوذر غفاریؓ کا آخری وقت ہے، وہ اس

جگہ تنہا رہتے تھے۔ سب فوراً ان کے پاس پہنچے۔

حضرت ابوذر غفاری کو سلام کیا، انھوں نے سلام کا جواب دیا، اپنے کفن دفن کے بارے میں ہدایت دیں اور انتقال کر گئے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے ان کی نماز جنازہ پڑھائی۔ سب نے مل کر ان کو سپرد خاک کیا اور حج کے لیے آگے روانہ ہوئے۔

حج سے واپسی کے بعد آپ نے 32ھ میں انتقال کیا۔ اس وقت آپ کی عمر 60 سال سے کچھ زیادہ تھی۔

آپؓ کی نماز جنازہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نبی کریم ﷺ کے خاص خادموں میں سے تھے۔

آپ ﷺ کی خدمت میں بہت زیادہ رہنے کا موقع ملا۔ علم وفضل کے اعتبار سے آپ کا مرتبہ بہت اونچا تھا۔

نبی پاک ﷺ کے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم ان کو قرآن کا سب سے بڑا عالم سمجھتے تھے۔

حضرت عمر فاروقؓ ان کے بارے میں فرماتے تھے:

ایک برتن ہے جو علم سے بھرا ہوا ہے۔

آپ قرآن کے قاری، دین کے فقیہ اور سنت کے عالم تھے۔

حضرت موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے:

''جب تک ہم میں عبداللہ بن مسعودؓ جیسا عالم موجود ہے تو مجھ سے کوئی مسئلہ دریافت نہ کرو''

حضرت ابومسعود بدری رضی اللہ عنہ اکثر کہا کرتے تھے:

''میں نہیں جانتا، رسول اللہ ﷺ کے بعد عبداللہ بن مسعودؓ سے بڑھ کر کوئی قرآن کا عالم ہے''

آپؓ احادیث کے بھی بہت بڑے عالم تھے۔ فقہ کے تو امام تھے۔ آپ بدعات کے سخت خلاف تھے۔

اگر معلوم ہوتا کہ کچھ لوگوں نے کوئی بدعت جاری کی ہے تو فوراً جا کر ان کی خبر لیتے تھے۔

حد درجے کے عبادت گزار تھے۔ روزے کثرت سے رکھتے تھے۔

آپؓ میں عاجزی بہت تھی، کوئی مسئلہ معلوم نہ ہوتا تو فوراً کہہ دیتے۔ میں نہیں جانتا۔

نبی کریم ﷺ کو آپ پہ اس قدر اعتماد تھا کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''جس چیز کو تمہارے لیے ابن مسعودؓ پسند کریں، میں بھی تمہارے لیے اس چیز کو پسند کرتا ہوں اور اس پر راضی ہوں۔''

اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوں۔

☆____☆____☆

☆____☆____☆

بقیہ: وہ کون تھا

اس نے جان چھڑا کر جانا چاہا۔وہ لوگوں کی نظروں اور سوالوں سے تنگ آچکا تھا۔اپنے پرائے، رشتے دار، محلے دار سب احوال ایسے پوچھتے جیسے بہت ہمدرد ہوں پھر پلٹ کر خبر تک نہ لیتے۔

"تم نے اپنا کیا حلیہ بنایا ہوا ہے اور یہ تمہارے پاس کیا ہے؟"

فرقان اس کے پیچھے آیا۔فہد نے بدرنگ سی شرٹ پہن رکھی تھی۔پینٹ بھی میلی تھی،بکھرے بال اور چہرے پر پسینہ چمک رہا تھا۔

"کیا ہوسکتا ہے؟بے چارہ یقیناً کئی دنوں سے کسی مزار کے سامنے بیٹھ کر بھیک مانگ رہا ہو گا جو پیسے ہاتھ آئے اس سے یہ سب خرید لیا۔"

اس نے گھبرا کر نثار کو دیکھا۔وہ قریب ہی اپنے دوستوں کے ہمراہ بوڑھے برگد کی چھاؤں تلے بیٹھا تھا۔نثار کے الفاظ پر اس کے سب دوست ہنسنے لگے تھے۔فرقان کی نگاہوں میں اس کے لیے ہمدردی تھی۔

"یہ کیسی باتیں کر رہے ہو تم لوگ؟"

فرقان ان سے الجھنے لگا۔

"کچھ بھی ہو نثار!تم نے مجھے ایک درست مشورہ دیا تھا جس کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں اور تم میرے محسن ہو اس لیے مجھے تم سے کوئی شکایت بھی نہیں۔"

اس کے الفاظ نے نثار کو حیران کر دیا۔

"کونسا مشورہ؟"اس نے الجھ کر پوچھا۔

"اس بابا کی طرح آلو کی چاٹ بیچنے کا مشورہ۔رزق حلال کمانے کا مشورہ۔بے شک تم میرا مذاق اڑا رہے تھے مگر تمہاری بات میرے دل کو لگی۔میں تمہارا ممنون ہوں۔"

وہ ان سب کو حیران چھوڑ کر اس آلو کی چاٹ بیچنے والے بابا سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔اسے یقین تھا وہ رزق حلال کما کر جلد از جلد اپنی ماں کا بائی پاس کرالے گا۔اسے دن رات محنت کرنا تھی۔وہ اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔اس کے پاس لوگوں کی استعجابیہ نظروں اور احمقانہ سوالوں کے لیے وقت نہ تھا۔اب اگر نثار یا اس جیسے بچے اس کا مذاق بھی اڑاتے تو اسے فرق نہ پڑتا۔بچے اس کے پاس جمع ہونے لگے اور اس کے کام میں تیزی آگئی۔

ڈاکٹر نے کہا تھا کل تک ہر صورت بائی پاس کرانے کا فیصلہ کرلو اور اس کے پاس بمشکل چند سو جمع ہوئے تھے۔اتنے کم پیسوں سے بھلا کیا ہوسکتا تھا۔وہ اپنی ہی سوچوں میں غلطاں تھا جب اس کے دوست چلے آئے ان سب میں اٹک کے

سہارے لنگڑاتے ہوئے چل کر آتا نثار بھی شامل تھا۔اس کے ساتھ اس کا کوئی کزن بھی تھا۔نثار کو دیکھ کر فہد تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا اور اسے سہارا دے کر درخت کے نیچے رکھی کرسی پر بیٹھایا۔

"تم کیوں آئے؟تمہیں آرام کرنا چاہیے تھا۔" فہد اسے دیکھ کر اپنی پریشانی کے باوجود مستفسر ہوا۔

"تمہارا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں اگر اس روز تم میری جان نہ بچاتے تو آج ایک ٹانگ کے معمولی فریکچر کے بجائے کب کا موت کو گلے لگا چکا ہوتا۔"

نثار اس کا احسان مند تھا۔فہد نے گہری سانس لی۔

"اس دن یہ اتفاق ہی تھا کہ میں اس روڈ سے گزر رہا تھا جہاں تمہارا ایکسیڈنٹ ہوا اور تم بے یارو مددگار پڑے تھے۔خون بہہ جانے کی وجہ سے تم پر غشی طاری تھی۔اللہ کو تمہاری جان بچانا مقصود تھا اس لیے اس نے مجھے بھیج دیا۔تمہاری زندگی تھی میں وقت پر نہ پہنچتا تو کوئی اور آجاتا۔تمہیں میرا شکریہ ادا کرنے کے بجائے اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

پرانی ڈگر کو چھوڑو اور اپنی پڑھائی پر توجہ دو اس طرح زندگی کو ضائع کرنے کے بجائے اسے اچھے کاموں میں وقف کرو۔اب تک تم سمجھ ہی گئے ہو گے کہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔"

آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے فہد رونے لگا تھا اسے اپنے ابو یاد آرہے تھے۔اسے اپنی ماں کی زندگی کی فکر تھی۔

"کاش ہم لوگ تمہارے لیے کچھ کر سکتے۔" نثار نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"تم سب میرے ساتھ ہو۔میرے لیے یہی بہت ہے۔اب تم سب جاؤ!اسمبلی شروع ہونے والی ہے۔اسکول کا گیٹ بند ہو جائے گا۔"

فہد نے اپنی نم آنکھیں بازو سے پونچھ لیں۔وہ سب اس کو تسلی کے الفاظ ادا کر کے اسکول میں چلے گئے۔جبکہ نثار اپنے کزن کے ساتھ گھر کی طرف چلا گیا۔

وہ جانتا تھا اس کی امی جلد صحت یاب ہو جائیں گی لیکن اس کے لیے ان کا جلد از جلد بائی پاس ہونا ضروری تھا۔فہد اسکول کے بند دروازے کو حسرت سے دیکھ رہا تھا۔اب سڑک پر صرف گاڑیاں گزرتی نظر آرہی تھیں۔فہد اور آلو کی چاٹ بیچنے والے بابا کے درمیان ہمیشہ کی طرح خاموشی تھی۔وہ بابا کم ہی کسی سے مخاطب ہوتے تھے۔فہد نے اپنا آدھا خالی تھال اٹھایا اور جانے لگا۔

"آج تمہاری ماں کا آپریشن ہے۔"

بابا نے پتا نہیں پوچھا تھا یا بتایا تھا۔فہد نے چونک کر دیکھا۔پھر نفی میں گردن ہلا دی۔

"آج تمہاری ماں کا آپریشن ہے اور تم سارے پیسے یہاں چھوڑ کر جا رہے ہو۔"

بابا نے اسے پلاسٹک کے ڈبے کی طرف متوجہ کیا۔جس میں وہ پیسے رکھتا تھا۔آج تک کے سارے پیسے جو اس نے آلو کی چاٹ بیچ کر کمائے تھے۔پندرہ سو روپے یہ اس کی محنت کی کمائی

تھی۔اس کی جمع پونجی تھی۔اس نے بھیگی آنکھوں کے ساتھ ان پیسوں کی جانب دیکھا۔

"یہ آپ رکھ لیں۔یہ میرے کسی کام کے نہیں۔شاید آپ کے کام آجائیں۔"

اس کی آواز بھی بھیگی ہوئی تھی۔

"اور تمہاری ماں کا آپریشن؟"

فہد کو حیرت ہوئی کہ بابا اس کی اور اس کے دوستوں کی باتیں نہایت توجہ سے سنتے تھے لیکن اس نے آپریشن کے متعلق یہ نہیں کہا تھا کہ آج ہے۔

"بائی پاس کرانے کے لیے بہت پیسے چاہیے جو ہمارے پاس نہیں ہیں۔"

اس نے بے دلی سے جواب دیا۔

"یہ پیسے ہیں تو۔"

فہد کو آج شک ہوا بابا صرف ایک پاؤں سے ہی معذور نہیں تھے بلکہ ان کی دماغی حالت بھی درست نہ تھی۔وہ جھنجھلا گیا۔

"بابا! یہ پیسے آپ رکھ لیں مجھے ضرورت نہیں ان سے کچھ نہیں ہوسکتا۔" وہ تیز تیز جواب دے کر جانے لگا۔

"حلال رزق میں بہت برکت ہوتی ہے۔تمہارے خون پسینے کی کمائی ہے۔خدا تمہیں اس کا اجر دے گا۔"

"بابا! میں نے کہا ناں یہ آپ رکھ لیں۔میری طرف سے تحفہ سمجھیں۔بس میری ماں کی زندگی کے لیے دعا کیجیے گا۔"

فہد نے وہ ڈبہ اٹھا کر بابا کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"میں دعا کروں گا تمہاری ماں کا بائی پاس کامیاب ہوجائے۔"

"پہلے کوئی سبب تو بنے بائی پاس ہونے کا۔"

فہد بڑبڑایا۔

"اللہ ہے ناں مسبب الاسباب۔وہ وہاں سے راستہ بناتا ہے جہاں انسان کو راستہ نظر آنا بند ہوجاتا ہے۔وہاں سے عطا کرتا ہے جہاں سے انسان کے خواب و خیال میں نہیں ہوتا۔تم بے فکر ہو کر جاؤ وہ ضرور مدد کرے گا۔"

فہد نے جاتے جاتے بابا کی آواز سنی اسے اسپتال پہنچنے کی جلدی تھی کل اس کی ماں کی حالت بہت خراب تھی۔وہ اسے اسپتال میں رکنے کی اجازت نہیں دیتی تھیں بلکہ بہن بھائیوں کا خیال رکھنے کی تاکید کر کے گھر بھیج دیتی تھیں۔اس کا ایک بھائی دس سال کا تھا دوسرا آٹھ سال کا اور بہن صرف چھ سال کی تھی۔ان کا خیال رکھنا بھی ضروری تھا۔ان کی غربت کی وجہ سے رشتے داروں نے قطع تعلق کر لیا تھا۔سگے تایا اور چچا بھی خبرگیری نہ کرتے تھے۔فہد ان سب کی بے حسی کی وجہ سے بھی دلبرداشتہ تھا۔وہ اپنی ہی سوچوں میں غرق بس میں سوار تو ہوگیا لیکن یہ بھول گیا کہ اپنے سارے پیسے جذبات میں آکر بابا کو دے آیا ہے اور اب اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہیں ہے۔کنڈیکٹر کرایہ مانگنے آیا اور وہ گم صم سا اس کی

صورت دیکھتا رہا۔

"اترو بس سے پتا نہیں کہاں کہاں سے آجاتے ہیں۔کرایہ نہیں ہے تو بس میں سوار ہی کیوں ہوتے ہو۔"

بد دماغ کنڈیکٹر نے اسے اچھی طرح بے عزت کرنے کے بعد پہلے اسٹاپ پر ہی بس سے اتار دیا۔ باقی کا راستہ اس نے پیدل طے کیا۔وہ اسپتال پہنچا تو اپنی ماں کا خالی بیڈ دیکھ کر اس کی چیخ نکل گئی۔

"امی میری امی کہاں ہیں؟ اس نے نرس کو روک کر پوچھا۔"

"کون زرینہ بیگم؟"

نرس کے لیے اس کا چہرہ جانا پہچانا تھا پچھلے دو ہفتوں سے اس کی ماں اسپتال میں زندگی اور موت کے درمیان معلق تھیں۔بمشکل کبھی حالت سنبھلتی تھی پھر بگڑ جاتی تھی۔نرس کے استفسار پر اس نے سرعت سے اثبات میں سر کو جنبش دی۔

"وہ تو آپریشن تھیٹر میں ہیں ان کا بائی پاس ہو رہا ہے۔"

جواب سن کر وہ ساکت رہ گیا۔

"امی! کیسی ہیں اب آپ کی طبعیت؟"

فہد ہشاش بشاش اپنے بہن بھائیوں کو لے کر اسپتال آیا تھا۔اس کی ماں کے چہرے پر نقاہت تھی لیکن انہیں دیکھ کر شفیق مسکراہٹ در آئی۔

"ٹھیک ہوں۔"

انہوں نے چھوٹی وانیہ کو چوما۔

اسی وقت ڈاکٹر صاحبہ ان کے معائنے کے لیے آگئیں۔

"بچو! منع کیا ہے اسپتال بار بار نہیں آنا۔ دو چار دن میں آپ کی امی کو چھٹی مل جائے گی۔اب آپ لوگ گھر جائیں۔"

ڈاکٹر نے انہیں جانے کا کہا۔فہد نے ان سب کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔

"ڈاکٹر صاحبہ کیا ابھی تک نہیں پتا چلا کہ ہماری مدد کس نے کی ہے۔امی کے بائی پاس کے لیے اتنی بڑی رقم کس نے دی؟"

ڈاکٹر شفقت سے مسکرا دیں۔

"بیٹا! دینے والے نے اپنا نام صیغہ راز میں رکھنے کو کہا تھا لیکن انہوں نے یہ کہا تھا کہ یہ آپ کی رقم ہے جو انہوں نے واپس کی ہے۔شاید کوئی قرض تھا۔"

"لیکن ڈاکٹر صاحبہ ہمارے پاس تو اتنی رقم یکمشت کبھی آئی ہی نہیں نہ کسی کو قرض دیا۔"

فہد کی امی بھی حیران تھیں۔

"میں کیا کہہ سکتی ہوں؟"

ڈاکٹر نے لاعلمی ظاہر کرتے ہوئے بات ختم کر دی۔فہد نے بھی مزید نہیں کریدا۔

بہت عرصے دن بعد وہ اسکول آیا تھا۔ہر چیز اپنی جگہ پر تھی۔اس کے سارے دوستوں نے اسے بہت یاد کیا۔اس کے اساتذہ بھی اس کی

واپسی پر خوش تھے اور وہ خود ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔اس کی ماں صحت یاب ہوگئی تھیں۔فہد کو جیسے نئی زندگی مل گئی تھی۔

اس نے امی سے کہا تھا۔اسکول سے واپس آنے کے بعد وہ روزانہ آلو چاٹ بیچا کرے گا۔فہد کو محنت کرنے سے کوئی عار نہ تھی۔

"فرقان! یہاں وہ بابا آلو چاٹ بیچا کرتے تھے۔وہ کہاں گئے نظر نہیں آرہے؟"

وہ چھٹی کے وقت دوستوں کے ساتھ باہر آیا تو بابا کی مخصوص جگہ کو خالی دیکھ کر فرقان سے پوچھا۔

"وہ تو بہت دنوں سے نہیں آرہے۔ہاں انہوں نے کہا تھا کہ فہد اسکول آئے تو اسے اس کی ماں کے بائی پاس کی مبارکباد دے دینا اور یہ بھی کہنا کہ اس کے پیسے میرے بہت کام آئے۔نیکی کا بدلہ نیکی ہے۔ہم انسان احسان نہیں اتار سکتے۔اللہ فہد بیٹے کو اس کی نیکی کا اجر دونوں جہان میں دے گا۔"

فہد کو آخری دن والی ملاقات یاد آئی۔اس کا دل زور سے دھڑکا۔

"فرقان تمہیں کچھ یاد ہے کہ وہ بابا کب سے نہیں آرہے؟"

اس نے شدت جذبات سے کانپتی آواز میں استفسار کیا۔

"ہاں آخری بار اسی دن دیکھا تھا جس دن تم اسکول آئے تھے۔اس کے بعد سے نہیں دیکھا۔"

فہد نے بے یقینی سے فرقان کو دیکھا۔فرقان بھی الجھ گیا۔

"سب خیریت تو ہے؟"

"فرقان بابا کو کیسے پتا تھا کہ میری امی کا آپریشن اسی دن ہوگا؟ جبکہ یہ بات تو مجھے بھی نہیں معلوم تھی۔"

فرقان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

"فرقان! وہ شخص آخر کون تھا؟"

"فہد! وہ شاید غریب شخص کے بھیس میں اللہ کا کوئی نیک بندہ تھا۔"

فرقان بھی حیرت زدہ تھا۔

اس دن کے بعد فہد نے بابا کو بہت ڈھونڈا مگر وہ نہ ملے۔فہد نے کالج سے یونیورسٹی اور پھر عملی زندگی میں قدم رکھ دیا۔

فہد کو ایک بات اچھی طرح سمجھ آگئی تھی کہ اس کا دیا ہوا پیسہ کسی کے کام آسکتا ہے اس نے دوسروں کی مدد کو اپنا شعار بنالیا۔البتہ فرصت کے اوقات میں وہ یہی سوچتا رہتا تھا کہ وہ بوڑھا شخص آخر کون تھا جو اچانک ہی منظر سے غائب ہوگیا۔

"وہ کون تھا؟" ایک عام مفلس، قلاش شخص۔ ایک محنت کش، کوئی نیک انسان، اس کا مددگار اور محسن جس نے اس کی ماں کے بائی پاس کے لیے اسپتال میں پیسے جمع کرائے تھے۔وہ الجھ جاتا لیکن سمجھ نہیں پاتا تھا کہ "وہ کون تھا؟"

"وہ کون تھا"

☆.....☆.....☆

محمد طلحہ حنیف



یومِ بوس

خشک صحرا میں دور دور تک آبادی کا نام ونشان تک نہ تھا۔ وہ اور اس کا گھوڑا دونوں ہی بھوک اور پیاس کی شدت سے نڈھال ہو چکے تھے اور موت آنکھوں کے سامنے ناچ رہی تھی۔ قریب تھا کہ وہ گھوڑے سے گر پڑتا کہ اچانک کچھ ہی دور اسے ایک جھونپڑی نظر آئی۔ پہلے تو وہ سمجھا کہ یہ آنکھوں کا فریب ہے لیکن جب دوبارہ ذرا غور سے دیکھا تو آنکھوں میں چمک آگئی۔ وہ تیزی سے گھوڑا دوڑاتا ہوا جھونپڑی کے پاس پہنچا۔

قریب پہنچ کر اس نے بلند آواز میں کہا: کوئی ہے جو اس مسافر کی مدد کرے؟ کوئی ہے؟

جھونپڑی کا پردہ ہٹا اور ایک شخص باہر آیا۔ اپنے دروازے پر ایک اجنبی کو دیکھ کر اس نے کہا: خوش آمدید، اے معزز شخص۔

مسافر نے کہا: کچھ کھانے پینے کو مل جائے گا؟

کیوں نہیں؟ آپ اندر تشریف لائیے۔

میزبان کے پاس ایک ہی بکری تھی۔ اس نے دودھ دوہ کر اپنے مہمان کو پلایا اور بکری ذبح کر کے بیوی سے کہا کہ اسے پکاؤ۔ کھانا تیار ہوا تو مسافر نے پیٹ بھر کر کھانا کھایا، میزبان کا شکریہ ادا کیا اور پوچھا:

بھئی ایک اجنبی کی خاطر تم نے اپنی اکلوتی بکری ذبح کر ڈالی! بھلا یہ مہربانی کیوں؟

میزبان نے کہا: معزز مہمان، آپ جانتے ہیں کہ عرب اپنے مہمان کی خاطر جان تک قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتے، یہ تو پھر ایک حقیر سی دعوت تھی۔ میں حنظلہ ہوں اور میرا قبیلہ میزبانی کے لیے مشہور ہے۔

مجھے جانتے ہو؟ مسافر نے پوچھا۔

نہیں۔ جواب ملا۔

میں حیرہ کا بادشاہ نعمان بن منذر ہوں۔ شکار کی تلاش میں اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا۔ تم نہ ہوتے تو شاید اب تک صحرا کے گدھوں کی خوراک بن چکا ہوتا۔ تمہارا بے حد شکریہ، تم نے میری خوب خدمت کی ہے۔ اس کے لیے میں تمہیں اپنے ہاں آنے کی دعوت دیتا ہوں۔

ضرور آؤں گا۔ میزبان نے جواب دیا۔

بادشاہ نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور دھول اڑاتا اپنی منزل کی طرف روانہ ہوگیا۔

ٹھیک دو سال بعد حنظلہ کا کسی کام سے حیرہ

جانے کا اتفاق ہوا۔ اپنا کام نپٹا کر اس نے سوچا کہ کیوں نہ نعمان سے بھی مل لیا جائے۔

وہ بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا لیکن یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ بادشاہ نے اسے دیکھ کر بالکل خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ بادشاہ نے اگرچہ حنظلہ کو دیکھتے ہی پہچان لیا تھا لیکن وہ کچھ دیر تک بالکل خاموش رہا، جیسے کوئی بہت بڑی فکر لگ گئی ہو۔ آخر کار بولا:

تم! تم آج کیوں آئے؟ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ آج یوم بؤس (منحوس دن) ہے؟ ہمارا قانون ہے کہ آج کے دن جو بھی شخص ہمارے علاقے میں سب سے پہلے داخل ہوتا ہے اسے ہم قربانی کے لیے چن لیتے ہیں، تاکہ اس دن کی نحوست دور کی جاسکے۔

حنظلہ نے کہا: میرے علم میں یہ بات ہوتی تو میں کبھی آج کے دن آپ کے پاس نہ آتا۔

آج کے دن تو اگر میرا بیٹا بھی آتا تو میں اس کو قتل کرا دیتا، بہر حال میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔ نعمان نے بے رخی سے جواب دیا۔

ماحول پر سناٹا چھا گیا، پھر بادشاہ کی آواز دوبارہ گونجی: "تم اپنی آخری خواہش بتاؤ اور مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ مجھے تمہاری موت کا افسوس تو ہو گا مگر میں مجبور ہوں اور ہاں تمہیں تمہارا انعام بھی دے دیا جائے گا۔

حنظلہ نے نعمان بن منذر کے چہرے پر اٹل فیصلہ لکھا دیکھ لیا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو قسمت کے حوالے کیا اور بڑے اعتماد اور وقار سے بولا: موت کی دہلیز پر کھڑا ہو کر انعام حاصل کر کے میں کیا کروں گا۔ مجھے اجازت دیں تو میں اپنے گھر والوں سے مل آؤں اور اپنا انعام انہیں دے آؤں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ جو بھی وقت آپ مقرر کریں گے، میں اپنی موت کے لیے حاضر ہو جاؤں گا۔

بادشاہ نے کچھ دیر سوچا، پھر کہا: ٹھیک ہے، اپنا کوئی ضامن لے آؤ۔

حنظلہ نے بادشاہ کے پاس کھڑے شخص کو دیکھا۔ وہ بادشاہ کا وزیر" شریک بن عمرو" تھا۔ حنظلہ نے اسے ضامن بننے کی درخواست کی لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ وہیں ایک اور شخص قراد بھی موجود تھا۔ اس نے بادشاہ سے مخاطب ہو کر کہا کہ میں اس شخص کا ضامن بنتا ہوں (یعنی اگر حنظلہ نہ آیا تو اس کی جگہ میں موت قبول کرلوں گا)۔ حنظلہ نے اس کا شکریہ ادا کیا اور بادشاہ سے اجازت چاہی۔ بادشاہ نے اسے پانچ سو اونٹ بطور انعام دیئے اور کہا ٹھیک ایک سال بعد تم اسی وقت، اسی جگہ ہم سے ملو گے۔ حنظلہ نے اونٹ لیے اور چلا گیا۔

☆---☆---☆

ایک سال گزر گیا اور فیصلے کا دن آپہنچا۔

سب لوگ اس جگہ اکٹھے تھے اور حنظلہ کا انتظار کر رہے تھے۔ جوں جوں وقت گزرتا جا رہا تھا، لوگوں کے چہروں پر مایوسی پھیل رہی تھی۔ لیکن قراد پورے اطمینان اور سکون کے ساتھ کھڑا تھا۔

اسے یقین تھا کہ حنظلہ ضرور آئے گا۔

مقررہ وقت ختم ہونے پر بادشاہ نے جلاد کو حکم دیا کہ وہ حنظلہ کے بدلے قراد کی گردن اڑانے کی تیاری کرے۔ سب ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ایک بے گناہ شخص کے قتل پر سب کو افسوس تھا۔ سب نے بادشاہ سے درخواست کی کہ کم از کم سورج غروب ہونے تک حنظلہ کے آنے کا انتظار کرنا چاہیے۔ بادشاہ نے یہ بات مان لی۔

پھر سورج کے غروب ہونے کا وقت بھی ہونے لگا اور لوگوں میں بے چینی بڑھنے لگی۔ جب وقت پورا ہو چکا تو بادشاہ نے جلاد کو حکم دیا کہ قراد کی گردن اڑا دی جائے۔

اس کے ہاتھ پیچھے کی طرف مضبوطی سے باندھ دیے گئے اور قریب تھا کہ تلوار اس کی گردن تک پہنچتی کہ ایک شخص نے اچانک پکار کر کہا:

ٹھہرو۔۔۔۔۔وہ دیکھو، کوئی آ رہا ہے! یہ سن کر سب نظریں اٹھیں۔ دور کوئی شخص دوڑتا ہوا نظر آیا۔ جب وہ قریب آیا تو بادشاہ نے اسے پہچان لیا۔ اس نے فوراً حکم دیا:

تلوار واپس رکھ دو، حنظلہ آ گیا ہے۔

حنظلہ تیز دوڑتا ہوا بادشاہ کے پاس پہنچا۔ اس نے اپنا سانس بحال کیا، اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بڑے ادب سے معذرت کی اور کہا:

میں مقررہ وقت پر نہ پہنچ سکا۔ پیدل آنے کی وجہ سے تاخیر ہو گئی۔ لیکن اب میں قتل ہونے کے لیے تیار ہوں۔

حنظلہ نے اپنا سر جھکاتے ہوئے کہا۔

نعمان بن منذر، حنظلہ کے اس کردار سے بہت متاثر ہوا اور پوچھا: تمہیں کس چیز نے واپس آنے پر مجبور کیا؟

حنظلہ کا چہرہ روشن اور آواز جذبات سے لبریز تھی۔ اس نے بے ساختہ کہا: ایفائے عہد! میری وجہ سے ایک بے گناہ شخص کی جان چلی جائے یہ مجھے گوارا نہ تھا۔ مجھے عرب قوم کی عزت اور غیرت اپنی جان سے زیادہ پیاری ہے۔ آپ جلاد کو حکم دیں کہ وہ مجھے قتل کر دے۔

حنظلہ کے اس کردار نے بادشاہ کی نظر میں اس کی عزت اور وقار اور بلند کر دیا۔ اچانک اسے وہ دن یاد آ گیا جب وہ صحرا میں موت و حیات کی پگڈنڈی پر سوار تھا تو اس شخص نے اپنی بیوی سے لڑ کر اپنی اکلوتی بکری اس پر قربان کر دی تھی۔

آج وہی شخص اپنے قول کو پورا کرنے کے لیے اپنی جان کا نذرانہ لیے حاضر تھا۔ بادشاہ اٹھا، اس نے حنظلہ کو گلے لگایا اور اسے معاف کر دیا اور یوم بؤس کی اس مکروہ رسم کو ہمیشہ کے لیے خیر باد کہہ دیا، جو کئی برسوں سے بے گناہ لوگوں کے لیے موت کا پیغام لے کر آتی تھی۔

☆۔۔۔۔☆۔۔۔۔☆

ہمارے ہاں آج کل حافظے کی کمی کی بہت شکایات ہیں۔

آئیے آج اس مضمون میں ہم حافظہ تیز کرنے کے تیر بہدف نسخے عرض کرتے ہیں:

اس سے پتا چلتا ہے کہ گناہوں کا ایک اثر یہ بھی ہوتا ہے کہ آدمی کی یادداشت (حافظہ) کم زور ہو جاتا ہے۔ اس لیے ہر طرح کے صغیرہ و کبیرہ گناہ سے بچنے کا اہتمام نہایت ضروری ہے۔

حافظہ تیز کرنے والے اعمال



حواء بنت زبیر

۱ گناہوں سے اجتناب

حافظہ کی تیزی میں سب سے زیادہ کردار گناہوں سے اجتناب ہے۔ گناہوں سے حافظہ کم زور ہوتا ہے۔

امام شافعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے استاذ "وکیع" (رحمہ اللہ) سے اپنے حافظہ کے خراب (کم زور) ہونے کی شکایت کی تو انہوں (وکیع) نے مجھے گناہوں سے بچنے کی نصیحت کی۔

۲ یکسوئی

دوسری چیز جس کا اہتمام کرنے کی ضرورت ہے وہ یک سوئی ہے، تعلیم کے دوران ایسی کوئی بھی مشغولیت جو توجہ تقسیم یا منتشر کردے وہ حفظ کے لیے نقصان دہ ہے، خصوصاً موبائل وغیرہ کا بے جا استعمال یا دوسری سرگرمیاں یا کھیل کود میں حد سے زیادہ مشغولیت وغیرہ۔ اس لئے

کوشش کریں کہ دورانِ تعلیم اپنے سارا دھیان صرف اور صرف تعلیمی سرگرمیوں پر مرکوز رکھیں۔کسی قسم کے بیرونی مشاغل سے مکمل پرہیز کریں۔

یہاں تک کہ ہمارے اکابر دورانِ تعلیم روزگار کرنے یا کسی بھی جز وقتی ملازمت سے بھی منع فرماتے ہیں تاکہ توجہ منقسم نہ ہو۔اس سے ذہانت میں بے پناہ اضافہ ہوتا ہے۔

۳

کشمش اور بادام کا استعمال

ہمارے اکابر سے ذہانت کی تقویت کے اسباب سے متعلق یہ بھی منقول ہے کہ نہار منہ کشمش اور بادام کا استعمال حافظہ کے لیے مفید ہے۔

۴

مسواک اور تلاوت قرآن و استغفار

مسواک کا پنج گانہ نماز سے پہلے وضو میں استعمال اور کثرتِ تلاوتِ قرآن مجید و استغفار سے باطن روشن ہوتا ہے، جو قوتِ حافظہ میں اضافہ کا باعث ہے۔

حصولِ علم میں مسلسل محنت، بلاعذر ناغہ نہ کرنا قوتِ حافظہ کے لیے اچھے اعمال ہیں۔

5

مکمل نیند اور آرام کا خیال

حافظہ اور ذہانت پر کم نیند اور بے خوابی زہر کا اثر کرتی ہے، اس سے ذہنی الجھن پیدا ہوتی ہے، لہٰذا نیند پوری کرنے کے اہتمام کے ساتھ دوپہر کے اوقات میں قیلولہ کی عادت ڈالیں، اس سے ذہن بیدار رہنے کے ساتھ حافظہ بھی اچھا ہوتا ہے۔

نیز اگر آپ طالبِ علم ہیں تو جو چیز یاد کرنی ہو اسے مغرب کے بعد یاد کرنے کا اہتمام کریں، رات سونے سے پہلے اسے دہرالیں اور صبح اٹھنے کے بعد وضو و نماز سے فراغت کے بعد سب سے پہلے رات یاد کیا ہوا دُہرالیا کریں۔

ان شاء اللہ یہ وہ چند تیر بہدف نسخے ہیں جن سے حافظہ تیز ہوگا اور تعلیم میں رغبت و شوق بھی پیدا ہوگا۔

گھڑدوڑ کا بیان



حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گھوڑوں کو پھرتیلا بنایا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم پھرتیلے چھریرے بدن والے گھوڑوں کو مقام حیفاء سے ثنیۃ الوداع تک اور غیر پھرتیلے گھوڑوں کو ثنیۃ الوداع سے مسجد بنی زریق تک دوڑاتے تھے۔

انتخاب: محمد عبدالماجد



ایک معمر خاتون آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور بولیں:

”یارسول اللہ ﷺ! میں بوڑھی اور کمزور ہوتی جا رہی ہوں، مجھے کوئی ایسا عمل عنایت فرمائیں کہ میں بیٹھے بیٹھے ہی کر لیا کروں اور ثواب پالوں۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”سو بار سبحان اللہ، سو بار الحمد للہ، سو بار اللہ اکبر اور سو بار لا الہ الا اللہ کہہ لیا کرو۔“

یہ سوال کرنے والی خاتون کون تھیں۔ آئیے ان کے بارے میں پڑھتے ہیں؟

یہ خاتون قریش کے قبیلے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا قبیلہ ایک ہی ہے۔ یعنی آپ بنو ہاشم سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان کے بھائی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور و معروف صحابی بھی ہیں۔ ان کی والدہ کی وفات پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہت رنجیدہ ہوئے تھے۔

آپ کا نکاح ایک عرب شاعر ہبیرہ بن ابی وهب سے ہوا۔ آپ کے دل میں تو اسلام کی صداقت پہلے سے ہی موجود تھی تاہم آپ نے اس کا اعلان فتح مکہ کے موقع پر کیا، گویا آپ نے فتح مکہ کے موقع پر اسلام قبول فرمایا۔ ان کے شوہر اسلام نہیں لائے تھے اس لیے اسلامی قانون کے مطابق ان کی اپنے شوہر سے علیحدگی ہوگئی۔

فتح مکہ کے موقع پر انھوں نے دو کافر افراد کو امان دے دی جب کہ مسلمان مجاہدین انھیں پکڑنا اور مارنا چاہتے تھے۔ انھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کا تذکرہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

قَدْ أَجَرْنَا مَنْ أَجَرْتِ، وَ أَمَّنَّا مَنْ أَمَّنْتِ۔

”جسے تم نے پناہ دی، اسے ہم نے بھی پناہ

دی، جسے تم نے امن دیا، اسے ہم نے بھی امن دیا۔" اسی دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے گھر غسل فرمایا اور پھر آٹھ رکعات بھی ادا کیں۔

فتح مکہ کے کچھ دنوں بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے گھر تشریف لے گئے اور شربت نوش فرمایا، پھر کچھ شربت بچا کر انھیں پیش کیا، انھوں نے کہا: "اگرچہ میں روزے سے ہوں لیکن آپ کا بچا ہوا بابرکت پانی واپس نہیں کرنا چاہتی۔" پھر آپ نے اپنا روزہ افطار کرلیا اور وہ پانی پی لیا۔

ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں بکری پالنے کا مشورہ دیا اور فرمایا: "بکری لے لو یہ بڑی خیر و برکت کی چیز ہے۔"

ان سے 46/ حدیثیں مروی ہیں. آپ نے سن پچاس ہجری میں، حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور میں 85 سال کی عمر میں وفات پائی۔

آپ نے اولاد میں چار بیٹے چھوڑے جن کے نام یہ ہیں: عمرو، ہانی، یوسف، جعدہ۔ یہ سب مسلمان ہو گئے تھے اور اسلام کے لیے خدمات سر انجام دیتے رہے۔

نوٹ: ان صحابیہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانیے اور معرفت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین حاصل کیجیے۔

وہ کون تھے شمارہ شوال المکرم کا درست جواب:

حضرت حرام بن ملحان رضی اللہ عنہ

وہ کون تھے؟؟

شمارہ شوال المکرم ۱۴۴۴ھ کے انعام یافتہ

محمد ابراہیم

درست جواب ارسال کرنے والے دیگر قارئین

دانیال حسن۔ عائشہ بنت فاروق۔ نبت کلثوم۔ قاری محمد احمد۔ زوجہ محمد عدنان اسد اللہ شفیق۔ کفایت اللہ۔ عبدالہدی۔ بنت الیاس۔ عبدالمجید شاکر۔ آصفہ پروین صادق حسین۔ ماریہ بنت مجید۔ ہانیہ عبدالماجد۔ محمد داؤد۔ محمد انیس

بقیہ: راز سربستہ

یہ دروازہ صرف خاص شخصیات کے لیے کھولا جاتا ہے۔

ہال نما کمرے میں روضہ مبارک کی طرف جائیں تو سبز غلاف سے ڈھکی ہوئی ایک دیوار نظر آتی ہے۔ 1406 ہجری میں شاہ فہد کے دور میں اس غلاف کو تبدیل کیا گیا۔اس سے قبل ڈھانپا جانے والا پردہ 1370 ہجری میں شاہ عبد العزیز آل سعود کے زمانے میں تیار کیا گیا تھا۔مذکورہ دیوار 881 ہجری میں اُس دیوار کے اطراف تعمیر کی گئی جو 91 ہجری میں حضرت عمر بن عبد العزیز نے تعمیر کی تھی۔اس بند دیوار میں کوئی دروازہ نہیں ہے۔قبلے کی سمت اس کی لمبائی 8 میٹر، مشرق اور مغرب کی سمت 5.6 میٹر اور شمال کی جانب دونوں دیواروں کی لمبائی ملا کر 14 میٹر ہے۔

کہا جاتا ہے کہ 91 ہجری سے لے کر 881 ہجری تک تقریباً آٹھ صدیاں کوئی شخص آپ ﷺ کی قبر مبارک کو نہیں دیکھ پایا۔اس کے بعد 881 ہجری میں حجرہ مبارک کی دیواروں کے بوسیدہ ہو جانے کے باعث ان کی تعمیر نو کرنا پڑی۔

اس وقت نامور مورخ اور فقیہ علّامہ نور الدین ابو الحسن السمہودی مدینہ منورہ میں موجود تھے، جنہیں ان دیواروں کی تعمیر نو کے کام میں حصہ لینے کی سعادت حاصل ہوئی۔وہ لکھتے ہیں 14 شعبان 881ھ کو پانچ دیواری مکمل طور پر ڈھادی گئی۔دیکھا تو اندرونی چار دیواری میں بھی دراڑیں پڑی ہوئی تھیں، چنانچہ وہ بھی ڈھادی گئی۔ہماری آنکھوں کے سامنے اب مقدس حجرہ تھا۔مجھے داخلے کی سعادت ملی۔میں شمالی سمت سے داخل ہوا۔خوشبو کی ایسی لپٹ آئی جو زندگی میں کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔میں نے رسول اللہ ﷺ اور آپ کے دونوں خلفاء کی خدمت میں ادب سے سلام پیش کیا۔مقدس حجرہ مربع شکل کا تھا۔اس کی چار دیواری سیاہ رنگ کے پتھروں سے بنی تھی، جیسے خانہ کعبہ کی دیواروں

میں استعمال ہوئے ہیں۔ چار دیواری میں کوئی دروازہ نہ تھا۔میری پوری توجہ تین قبروں پر مرکوز تھی۔تینوں سطح زمین کے تقریباً برابر تھیں۔ صرف ایک جگہ ذرا سا ابھار تھا۔یہ شاید حضرت عمر کی قبر تھی۔قبروں پر عام سی مٹی پڑی تھی۔اس بات کو پانچ صدیاں بیت چکی ہیں، جن کے دوران کوئی انسان ان مہر بند اور مستحکم دیواروں کے اندر داخل نہیں ہوا۔

علامہ نور الدین ابو الحسن علی بن احمد سمہودی نے اپنی کتاب وفاء الوفاء میں حجرہ نبوی کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ

"اس کا فرش سرخ رنگ کی ریت پر مبنی ہے۔ حجرہ نبوی کا فرش مسجد نبوی کے فرش سے تقریبا 60 سینٹی میٹر نیچے ہے۔اس دوران حجرے پر موجود چھت کو ختم کر کے اس کی جگہ ٹیک کی لکڑی کی چھت نصب کی گئی جو دیکھنے میں حجرے پر لگی مربع جالیوں کی طرح ہے۔اس لکڑی کے اوپر ایک چھوٹا سا گنبد تعمیر کیا گیا جس کی اونچائی 8 میٹر ہے اور یہ گنبد خضراء کے عین نیچے واقع ہے"۔

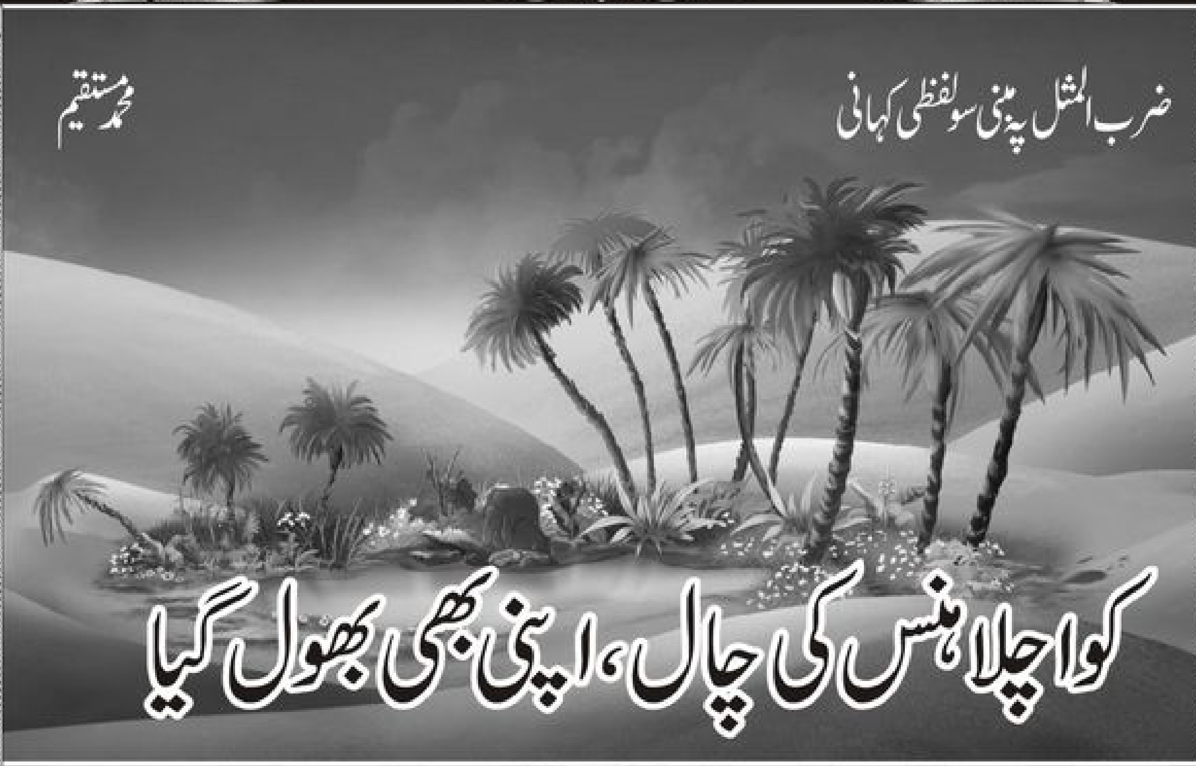
یہ ساری معلومات معروف کتاب "وفاء الوفاء با اخبار دار المصطفیٰ" مؤلفہ علی بن احمد السمہودی میں درج کی ہے۔

حجرے کی جالیاں

سب سے پہلے 668 ہجری میں جس شخصیت نے حجرے کی جالیاں تعمیر کرائیں وہ مملوک سلطنت کا پہلا نامور حکم راں رکن الدین بیبرس تھا۔اس نے دیواروں کے چاروں طرف فولادی جالیوں کو نصب کروایا۔

یہ فولادی جال 13 رمضان 886 ہجری کو حرمِ نبوی میں دوسری آگ لگنے کے واقعے سے پہلے تک موجود رہا۔اس کے بعد پرانے جال کو ہٹا دیا گیا اور اس کی جگہ 88 ہجری میں سنہری جالیاں نصب کی گئیں۔ ان پر سلطان قایتبای کا نام لکھا ہوا ہے اس نے روضہ مبارک میں موجود محراب پر وہ ہی عبارت تحریر کرائی۔ اس کے علاوہ گنبد خضراء کی تعمیر کرائی جو پہلے سفید رنگ کا تھا اور اُس وقت "گنبدِ فیحاء" کے نام سے معروف تھا۔

☆---☆---☆



ضرب المثل پہ مبنی سو لفظی کہانی

کوا چلا ہنس کی چال، اپنی بھی بھول گیا

محمد مستقیم

سائنس دان کا قہقہہ گونجا۔ اس کا معاون چونک گیا۔

”باس! کیا ہوا؟“

”میں کامیاب ہو گیا۔“

”ارے واہ! زبردست، مطلب انسان بھی کچھوؤں کی طرح ڈیڑھ سو سال تک جی سکیں گے؟“

”بالکل، میں ڈوز لینے لگا ہوں، کیا تم بھی لو گے؟“

”باس! پہلے جانوروں پہ تجربہ نہ کر لیں؟“

”ارے! کچھ نہیں ہوتا۔“

یہ کہہ کر سائنس دان نے دوا اپنے بازو میں انجیکٹ کر دی۔ ایک دن بعد اس کی نقل و حرکت کچھوے کی طرح سست ہو چکی تھی۔

یہ دیکھ کر معاون بولا:

”یہ تو وہی معاملہ ہو گیا کہ کوا چلا ہنس کی چال، اپنی بھی بھول گیا۔“



علم کی شمع

سلطان محمود غزنوی، افغانستان کے بادشاہ سبکتگین کا بیٹا تھا۔ وہ ایک بہادر سپاہی، تجربہ کار جرنیل، انصاف پسند بادشاہ اور سچا مسلمان تھا۔ وہ عالموں کا بہت بڑا قدر دان تھا۔ بڑے بڑے اہل علم و دانش اس کے دربار میں جمع ہوتے تھے۔

محمود ابھی چھوٹی عمر ہی کا تھا کہ ایک رات وہ کسی کام سے محل سے باہر گیا۔ اُس زمانے میں سڑکوں اور گلیوں میں روشنی کا انتظام نہیں ہوتا تھا۔

صرف بڑے بڑے چوراہوں پر کھمبوں کے ساتھ چراغ لٹکا دیے جاتے تھے۔ محمود محل سے باہر نکلا تو شاہی خادم چراغ اُٹھائے اُس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

ایک جگہ اس نے کیا دیکھا کہ ایک کھمبے میں ایک چراغ لٹک رہا ہے، اور اُس چراغ کے نیچے ایک لڑکا کتاب پڑھ رہا ہے۔ محمود اس لڑکے کے پاس آ کر رک گیا اور اُس سے پوچھنے لگا:

''تم کون ہو؟''

لڑکے نے ادب سے جواب دیا:

''حضور! میں ایک طالب علم ہوں۔''

محمود نے پوچھا:

''اس وقت یہاں کیوں کھڑے ہو؟''

لڑکے نے جواب دیا:

''حضور! میرے ماں باپ بہت غریب ہیں، وہ میرے لیے چراغ کا خرچ برداشت نہیں

کر سکتے، اس لیے میں یہاں آ جاتا ہوں، اور سرکاری چراغ کے نیچے کھڑے ہو کر سبق یاد کرتا ہوں۔"

محمود نے یہ سن کر اپنے ایک خادم کی طرف دیکھا اور اس سے کہا:

"تم اس لڑکے کے ساتھ جاؤ اور یہ چراغ اور ایک سال کے لیے تیل کا خرچ اس کے گھر دے آؤ!"

خادم چراغ لے کر لڑکے کے ساتھ اس کے گھر گیا اور چراغ اور اُس کے ساتھ ایک سال کے لیے تیل کا خرچ دے آیا۔"

اس رات محمود جب بستر پر لیٹا تو اسے خواب میں ایک بزرگ نظر آئے، انھوں نے فرمایا:

"محمود! تم نے ایک غریب طالب علم کے گھر میں جس طرح علم کی شمع روشن کی ہے، اللہ تعالیٰ اسی طرح تمہارا نام روشن کرے گا۔"

چنانچہ جب محمود غزنوی بادشاہ بنا تو اس نے ہندوستان پر سترہ حملے کیے اور یہاں اسلام کا بول بالا کیا۔ اسی وجہ سے مسلمان اُسے غازی اور مجاہد کہتے ہیں اور اسلام کی تاریخ میں اُس کا نام شمع کی طرح روشن ہے۔

پیارے بچو! تم نے دیکھا کہ ایک غریب کی مدد نے محمود غزنوی کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

کیا خوب فرمایا ہے ہمارے پیارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے:

"جو کسی تنگ دست کی پریشانی دور کرتا ہے اللہ دنیا اور آخرت میں اُس پر آسانی کے راستے کھول دیتا ہے۔"

انتخاب و مراسلہ: عبدالمجید شاکر

☆---☆---☆

خوشی

وقاص کی دوسرے بچوں کی طرح خوشی دیدنی تھی۔ کیوں کہ آج عید تھی۔ وہ رات بھر اس خوشی کی وجہ سے صحیح طرح سو بھی نہیں پایا تھا۔ اس کے کپڑے تو درزی نے دو دن قبل ہی سلائی کر دیئے تھے۔ اس بار اس نے دو عدد سوٹ سلائی کروائے تھے۔ وہ چاند رات کو اپنے ابو کے ساتھ بازار گیا اور اپنے لیے خوبصورت سی گھڑی اور عینک بھی لے آیا تھا۔

عید کی صبح جیسے اس کی آنکھ کھلی تو اس ہر سو خوشیوں کے رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے جلدی سے غسل کیا۔ نئے کپڑے اور نیا جوتا پہنا۔ اس نے اپنی ماں کے ہاتھوں بنی میٹھی کھیر کھائی۔ پھر تمام فیملی کو باری باری "عید مبارک" کہا اور تمام بڑوں سے عیدی بھی وصول کی۔ وہ اپنے ابو اور بھائی کے ساتھ عید گاہ نماز پڑھنے گیا تو راستے میں بہت زیادہ رش تھا۔

اسے راستے میں اپنا کلاس فیلو اعجاز نظر آیا جس نے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔

"السلام و علیکم! اعجاز تم نے عید کے لیے

نئے کپڑے نہیں پہنے۔"

اعجاز نے سر خم کر کے نم لہجے میں کہا۔"نہیں وقاص!۔۔۔تم جانتے ہو ابو کو کب سے بیماری نے بستر پر گرایا ہوا ہے۔امی سارا دن کپڑے سلائی کر کے گھر کا خرچ چلاتی ہے۔مہنگائی کی وجہ سے اس بار مجھے کپڑے نہیں ملے۔"

وقاص پریشان سا ہو کر گہری سوچ میں مبتلا ہو گیا۔پھر اسے اچانک کچھ یاد آیا اس نے اعجاز کو اپنے ساتھ لیا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس نے اپنا دوسرا نیا سوٹ اعجاز کو دے دیا اور کہا جلد سے گھر جا کر نیا سوٹ پہن لے تاکہ وہ دونوں دوست مل کر نئے سوٹ پہن کر عید کی نماز پڑھنے جایں۔اعجاز جب نیا سوٹ پہن کر گھر سے نکلا تو اس کی خوشی دیدنی تھی۔وقاص کو بھی یوں لگ رہا جیسے عید کی خوشی اب پہلے سے بھی کئی گنا بڑھ گئی۔وہ دونوں دوست خوشی خوشی عید گاہ کی طرف عید کی نماز پڑھنے کے لیے روانہ ہو گے۔

جب مسجد میں وقاص کے ابو نے یہ دیکھا کہ وقاص نے اپنا نیا سوٹ ایک امداد کے مستحق بچے کو دیا ہے تو ان کا چہرہ بھی خوشی سے کھل اٹھا۔کیوں کہ وہ وقاص کو اکثر سمجھاتے رہتے تھے کہ اسلام ہمیں غریب اور مستحق لوگوں کی مدد کرنے کی تلقین کرتا ہے۔یہ آپ ؐ کی سنت بھی ہے۔جس پر آج وقاص عمل پیرا ہو چکا تھا۔

از قلم: بہرام علی وٹو

☆۔۔۔☆۔۔۔☆

یہ بیچارے محنت کش۔۔۔!

آج شام باہر نکلا تو ایک چٹائی فروش نے گزرتے ہوئے پانی کی فریاد کی۔میں نے ایک بچے کو پانی لینے بھیجا۔اتنے میں اس نے بھاری چٹایاں کندھوں سے اتار کر نیچے رکھی اور کندھوں کو دبا کر ریلیکس کرنے لگا۔شاید تھک گیا تھا۔میں نے کچھ حال احوال پوچھا اور تھوڑی خوش گپیاں شروع کر دی۔کہ شاید میرے دو بول سے صبح کا تھکا ہارا بندا کچھ اچھا محسوس کرنے لگے۔

اتنے میں پانی آ گیا۔اور میں نے ان سے چٹائی والی گٹھی اٹھانے کی اجازت چاہی۔تاکہ وزن کا اندازہ لگایا جا سکے۔کہ کیسے یہ لوگ رزق حلال کی خاطر گلی گلی مشقت طلب گٹھری اٹھائے لیے پھرتے ہیں۔

پہلے پہل تو یہ گٹھری بہت زیادہ وزنی محسوس نا ہوئی۔مگر چند منٹ گزرنے کے ساتھ جب کندھے کے ساتھ بندھی رسیاں چبھنا شروع ہوئیں۔تو احساس ہوا،کہ انہیں اٹھائے پھرنا اتنا بھی آسان کام نہیں۔سارا دن لیے گھومنا انکی ہی ہمت ہے!

اور پھر جب اپنی ذات کی طرف دیکھا۔اور سوچا کہ کیا ہمیں اپنے رب کا شکر گزار نہیں ہونا چاہیے کہ اس نے ہمارا رزق کتنا ہی کم مشقت طلب کاموں میں رکھا ہوا ہے۔اگر میں اسکی جگہ ہوں،تو آخر کتنے دن یہ کام سر انجام کر پاوں گا۔۔۔؟

ورنہ، ہم میں ایسے کیا پھول بوٹے لگے تھے، جو اس نے ہمیں یہ آسانیاں دی۔ وہ چاہتا تو ہم ان کی جگہ ہوتے، اور وہ ہماری جگہ۔ سو جب بھی ایسے لوگوں سے واسطہ پڑے، زیادہ نہیں تو کم سے کم انکا حال احوال پوچھ لیا کریں۔ تھوڑا پانی پلا دیا کریں۔ اچھے سے پیش آجایا کریں۔ اسی سے یہ بہت خوش اور اچھا محسوس کرنے لگتے ہیں

اور اگر آسان رزق و دولت سے رب نواز دے۔ تو اُس پر تکبر کرنے کی بجائے مزید جھک جایا کریں۔ کہ مالک تیری کرم نوازی ہے،۔ ورنہ میری یہ اوقات کہاں اور اپنے ارد گرد مستحق لوگوں کی مدد کرتے رہیں۔ تاکہ، تکبر اور رزق بانٹنے جیسے دونوں امتحانوں میں ہم با آسانی پاس ہوسکیں۔

میرا رب ہم سب کے لئے آسانیاں فرمائے۔

خوش رہیے، خوش رکھیے

مراسلہ: عبدالباقی بن محمد سلیم

☆___☆___☆

مکھی کیوں پیدا کی گئی؟

خراسان کا بادشاہ شکار کھیل کر واپس آنے کے بعد تخت پر بیٹھا تھا۔ تھکاوٹ کی وجہ سے اس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ بادشاہ کے پاس ایک غلام ہاتھ باندھے مؤدب سے کھڑا تھا۔ بادشاہ کو سخت نیند آئی ہوئی تھی مگر جب بھی اس کی آنکھیں بند ہوتیں تو ایک مکھی آ کر اس کی ناک پر بیٹھ جاتی تھی اور نیند اور بے خیالی کی وجہ سے بادشاہ غصے سے مکھی کو مارنے کی کوشش کرتا لیکن اس کا ہاتھ اپنے ہی چہرے پر پڑتا تھا اور وہ ہڑبڑا کر جاگ جاتا تھا۔

جب دو تین دفعہ ایسا ہوا تو بادشاہ نے غلام سے پوچھا' تمہیں پتہ ہے کہ اللہ نے مکھی کو کیوں پیدا کیا ہے' اس کی پیدائش میں اللہ کی کیا حکمت پوشیدہ ہے؟ غلام نے بادشاہ کا یہ سوال سنا تو اس نے ایسا جواب دیا جو سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

غلام نے جواب دیا بادشاہ سلامت! اللہ نے مکھی کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ بادشاہوں اور سلطانوں کو یہ احساس ہوتا رہے کہ وہ خود کو کہیں خدا نہ سمجھ بیٹھیں کیوں کہ وہ خود سے ایک مکھی کو بھی قابو نہیں کر سکتے۔ کہتے ہیں کہ بادشاہ کو اس غلام کی بات اتنی حکمت بھری لگی کہ اس نے اسے آزاد کر کے اپنا مشیر خاص مقرر کر لیا۔

مراسلہ: عائشہ بنت امیر

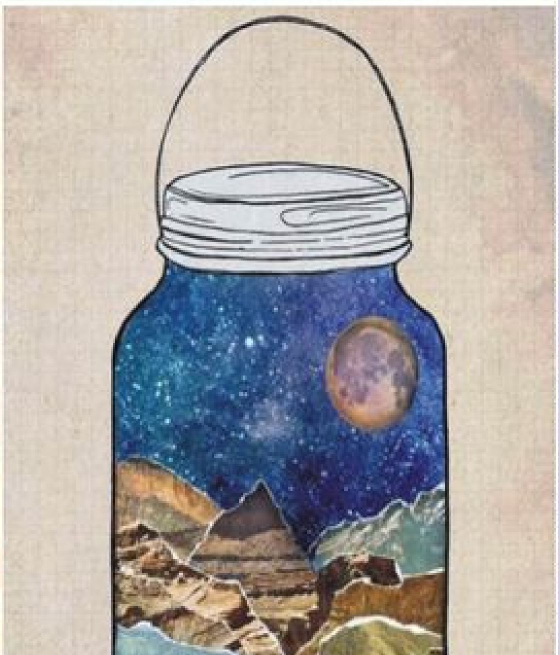
☆___☆___☆

آرٹ گیلری

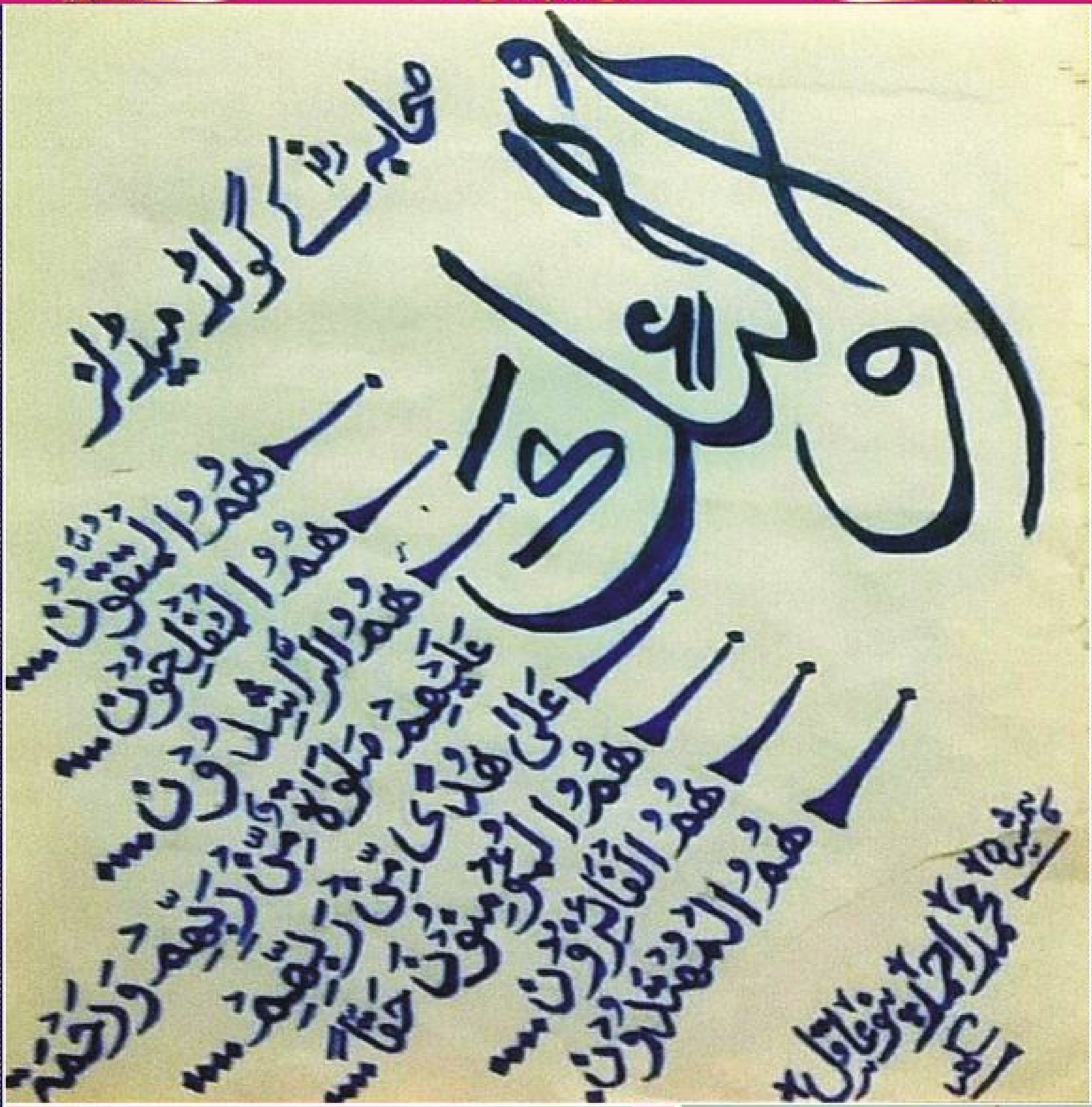


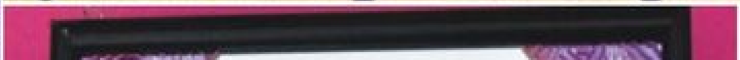


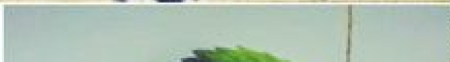






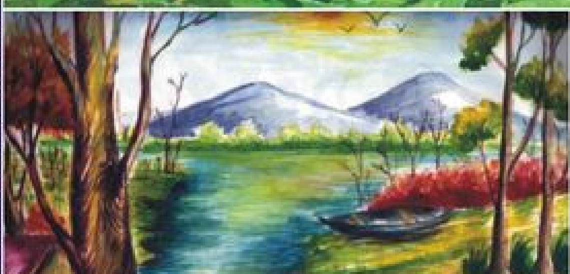

صحابہؓ کے گولڈ میڈلز
اولٰئک


سبحان اللہ











عمل کے پھول

فرد سے جان جھڑاؤ کہ بات بن جائے
جنوں کو کام میں لاؤ کہ بات بن جائے
بس ایک ضرب سے ٹوٹے گی قید کی زنجیر
اٹھاؤ تیغ اٹھاؤ کہ بات بن جائے
خدا کی راہ میں دولت کی حیثیت کیا ہے
متاع جان لٹاؤ کہ بات بن جائے
امیر شہر نے نمرودیت کو دی ہے ہوا
ستم کی آگ بجھاؤ کہ بات بن جائے
چمکتی تیغ سے، خنجر سے، اور نیزے سے
نصیب اپنا بناؤ کہ بات بن جائے
یہ تخت و تاج یہ شاہوں کے محل یہ زنداں
وجود ان کا مٹاؤ کہ بات بن جائے
کئی صدی سے اندھیرے میں رہ رہے ہیں غریب
چراغ اتنے جلاؤ کہ بات بن جائے
بہت قریب ہے منزل تمہارے قدموں سے
عمل کے پھول کھلاؤ کہ بات بن جائے
نبی کے عشق میں گردن کٹانے والوں کی
لحد پہ پھول چڑھاؤ کہ بات بن جائے

ہمشیرہ بابر آفریدی شہیدؒ